مواعظ حکیم الامت اور دینی رسائل کی اشاعت کا امین

ماہنامہ الامداد لاہور پاکستان

مدیر مسئول (مولانا) مشرف علی تھانوی

مدیر ڈاکٹر خلیل احمد تھانوی

جلد ۱۹ ربیع الثانی ۱۴۳۹ھ جنوری ۲۰۱۸ء شمارہ ۱

الرغبة المرغوبة والطلبة المطلوبة

توجہ الی اللہ کی حقیقت

ازافادات

حکیم الامۃ مجدد الملۃ حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

عنوانات وحواشی: ڈاکٹر مولانا خلیل احمد تھانوی

قیمت فی پرچہ =/۴۰ روپے زرسالانہ =/۴۰۰ روپے

ماہنامہ الامداد لاہور

۳۵۴۲۲۲۱۳
۳۵۴۳۳۰۴۹

پتہ دفتر جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ

۲۹۱۔ کامران بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

ناشر: (مولانا) مشرف علی تھانوی

مطبع: ہاشم اینڈ حماد پریس

۱۳/۲۰ ریٹی گن روڈ بلال گنج لاہور

مقام اشاعت

جامعہ دارالعلوم الاسلامیہ رجسٹرڈ لاہور پاکستان

الرغبة المرغوبة والطلبة المطلوبة

(توجہ الی اللہ کی حقیقت)

نمبر شمار	عنوانات	صفحہ
۱.....	خطبۂ ماثورہ.....	۹
۲.....	سبب بیان.....	۹
۳.....	انتخاب مضمون.....	۱۰
۴.....	تعلق مع الخلق کی حدود.....	۱۰
۵.....	غیبت کے بارے میں غلط فہمی.....	۱۱
۶.....	انتظار نماز بحکم نماز ہے.....	۱۳
۷.....	سید الطائفہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم کی شان..	۱۵
۸.....	آیت متلو کا مدلول.....	۱۶
۹.....	قرآن پاک کی اقصر آیات.....	۱۷
۱۰.....	حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت..	۱۸
۱۱.....	امامت میں کون افضل ہے.....	۱۹
۱۲.....	تعلق مع الخلق مقصود بالذات نہیں.....	۲۱

۱۳.....	نوجوان علماء کو ایک ضروری نصیحت.....	۲۱
۱۴.....	تکبر کی حقیقت.....	۲۳
۱۵.....	تعلق مع الخلق کا معیار.....	۲۴
۱۶.....	نوچندی کا میلہ.....	۲۴
۱۷.....	دوسروں کی دلجوئی بھی عبادت ہے.....	۲۶
۱۸.....	تمام عالم کو مرأۃ جمال حق سمجھنا.....	۲۷
۱۹.....	بعض پیرزادوں کی حکایت.....	۲۸
۲۰.....	جوتا گھسائی کا لطیفہ.....	۲۹
۲۱.....	حضرت حاجی صاحب کے علوم صحیحہ.....	۳۰
۲۲.....	سوداگر اور طوطی کی حکایت.....	۳۱
۲۳.....	حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا معمول.....	۳۲
۲۴.....	کاملین کا حال.....	۳۴
۲۵.....	شیخ زبان ہوتا ہے اور مریدکان.....	۳۴
۲۶.....	کتب تصوف کس کے لیے کارآمد ہیں.....	۳۵
۲۷.....	عبادت کا معمول کتنا ہونا چاہیے.....	۳۷
۲۸.....	چلہ سکوت.....	۳۹
۲۹.....	عبادت میں ضرورت اعتدال.....	۴۰

۳۰..... افراط وتفریط پر ایک لطیفہ..... ۴۱

۳۱..... ایک سب جج کی حکایت..... ۴۵

۳۲..... ہر نماز کے بعد تین مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کہنے کا حکم..... ۴۸

۳۳..... اصلاح خلق کا کام فرض کفایہ ہے..... ۴۹

۳۴..... تواضع میں ضرورت اعتدال..... ۵۰

۳۵..... طریق اصلاح کی شرط اول..... ۵۴

۳۶..... توجہ الی اللہ اصل مطلوب ہے..... ۵۵

۳۷..... بوقت فراغ مناسب معمول..... ۵۵

۳۸..... ذکر اللہ اور تجارت..... ۵۷

۳۹..... حرمات الٰہیہ کی ہتک..... ۵۹

۴۰..... توجہ الی الخلق سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حال..... ۵۹

۴۱..... حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نماز میں انتظام لشکر کشی..... ۶۱

۴۲..... مشورے کا طریقہ..... ۶۱

۴۳..... وساوس کا حکم..... ۶۲

۴۴..... آیت کی تشریح..... ۶۴

۴۵..... قلب کی تمنا اور اشتہا پر مواخذہ..... ۶۵

۴۶..... وساوس سے نجات کا سہل نسخہ..... ۶۷

۴۷..... عفت قلب کا مفہوم..... ۶۹
۴۸..... نفع لازمی نفع متعدی سے افضل ہے..... ۷۰
۴۹..... مریدین کے مراتب..... ۷۲
۵۰..... خلاصۂ وعظ..... ۷۴

وعظ

الرغبة المرغوبة و الطلبة المطلوبة

(توجہ الی اللہ کی حقیقت)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم .اما بعد

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ نے یہ وعظ ''الرغبة المرغوبة و الطلبة المطلوبة'' پسندیدہ چیزوں کی رغبت اور مقصود کی طلب کے بارے میں بمقام تھانہ بھون جامع مسجد خانقاہ امدادیہ ۱۲ جمادی الاولیٰ ۱۳۴۵ھ بروز جمعہ ۲ گھنٹہ ۵۵ منٹ تک کرسی پر بیٹھ کر ارشاد فرمایا۔ سامعین کی تعداد تقریباً ۵۰ تھی۔ مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی نے قلمبند کیا۔

مذکورہ وعظ میں حکیم الامت نے رجوع الی اللہ کی اہمیت پر کلام فرماتے ہوئے اس بات کی وضاحت فرمائی کہ نفع لازم، نفع متعدی سے افضل ہے اور نفع متعدی سے مقصود بھی نفع لازم ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ دین کے تمام احکام میں اعتدال کی راہ اختیار کی جائے۔ ایسے افراد جن سے لوگ وابستہ ہوں چاہے دینی ضرورت کے لیے یا دنیوی ضرورت کے لیے۔ ان کے لیے اس وعظ میں بہترین دستور العمل بیان کیا گیا ہے کہ وہ مخلوق کے تعلق کو خالق کے تعلق میں رکاوٹ نہ بننے دیں۔ راہ سلوک طے کرنے والوں کے لیے یہ وعظ انتہائی مفید ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو اس سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین

خلیل احمد تھانوی

۹ محرم الحرام ۱۳۳۹ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

خطبۂ ماثورہ

الحمد للّٰہ نحمدہٗ و نستعینہٗ ونستغفرہٗ و نؤمن بہ ونتوکل علیہ ونعوذ باللّٰہ من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا من یھدہ اللّٰہ فلا مضل لہ ومن یضللہ فلا ھادی لہ ونشھد ان لا الٰہ الا اللّٰہ وحدہ لا شریك لہ ونشھد انّ سیدنا ومولانا محمدًا عبدہ ورسولہ صلی اللّٰہ تعالیٰ علیہ وعلیٰ اٰلہ واصحابہ و بارك وسلم **اما بعد:**

فاعوذ باللّٰہ من الشیطن الرجیم

بسم اللّٰہ الرحمن الرحیم

﴿ فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ ﴾(۱)

سبب بیان

آج کے بیان کی وجہ بعض اہل علم مہمانوں کی درخواست ہے پہلے بھی ایک دفعہ اس قسم کی درخواست کی گئی تھی مگر اس وقت طبیعت اچھی نہ تھی مجھے عذر تھا اس لیے عذر ظاہر کر دیا تھا۔ جب کچھ ہفتوں کے بعد دوبارہ درخواست کی گئی تو میں اس کے رد سے شرما گیا گو عذر اب بھی ہے کہ طبیعت پوری طرح قوت پر نہیں ہے مگر بحمداللہ قوی عذر نہیں ہے اور پہلے سے اب طبیعت بہت اچھی ہے۔ گو مانعیت کے لیے ضعیف عذر بھی (۲) کافی تھا مگر حیاء کی وجہ سے میں نے ضعیف عذر کو پیش نہیں کیا اس لیے اس وقت بیان مختصر ہوگا مگر اب ان شاء اللہ ضرورت کے موافق ہوگا۔ میں نے درخواست کے وقت اتنا ضرور کہہ دیا تھا کہ اگر ضرورت کا مضمون

(۱) ''تو آپ جب فارغ ہوجایا کریں تو محنت کیجئے اور اپنے رب ہی کی طرف توجہ رکھیے'' سورۃ الم نشرح: ۷۔۸ (۲) اگرچہ تقریر سے انکار کرنے کے لیے کمزور عذر بھی کافی تھا۔

ذہن میں آگیا تو بیان کردوں گا کیونکہ کیف مااتفق[۱] بیان کردینا اور وقت کا پورا کرنا مجھے پسند نہیں۔

انتخاب مضمون

الحمدللہ میں ہمیشہ اس کی رعایت کرتا ہوں کہ بیان مخاطبین کی ضرورت کا ہو اور ان کی حالت موجودہ کے موافق ہو یہ کہہ کر میں فکر میں تھا کہ کیا بیان کروں اوراس کے بعد میں قرآن شریف پڑھتا رہا کہ دفعتاً یہ مضمون ذہن میں آگیا جو اہل علم اور مشائخ کی ضرورت کا ہے۔ بلکہ یوں کہئے کہ جن لوگوں کی طرف رجوع عالم[۲] ہے یہ ان کی ضرورت کا ہے خواہ وہ حقیقت میں عالم ہوں یا نہ ہوں شیخ ہوں یا نہ ہوں مقتدا ہوں یا نہ ہوں مگر ان کی طرف مخلوق کا رجوع[۳] ہو خواہ کسی دینی سبب سے رجوع ہو یا دنیوی سبب سے غرض جس کو مخلوق سے سابقہ زیادہ پڑتا ہو یہ مضمون اس کے کام کا ہے اس میں علماء ومشائخ ومقتدا بھی داخل ہیں اور حکام ورؤساء وامراء بھی داخل ہیں کیونکہ دوسرے طبقہ کے ساتھ بھی حوائج مخلوق وابستہ ہیں اتنا فرق ہے کہ پہلے طبقہ کے ساتھ دینی علاقہ سے مخلوق کا تعلق ہے اور دوسرے طبقہ کے ساتھ دنیوی علاقہ سے وابستگی ہے۔ اس تقریر سے اجمالاً معلوم ہوگیا ہوگا کہ یہ مضمون بہت ضرورت کا ہے کیونکہ اس وقت مخاطب زیادہ تر وہ حضرات ہیں جن کی طرف رجوع عالم ہے۔

تعلق مع الخلق کی حدود

پس ان کو تعلق مع الخلق کی حدود[۴] کا معلوم ہونا ضرور ہے۔ تفصیل اس

(۱) بلاضرورت جو بات سمجھ میں آئی بیان کردی (۲) جن لوگوں کی طرف لوگ رجوع کرتے ہیں جیسے علماء ومربیین (۳) لوگ ان کی طرف رجوع کرتے ہوں (۴) مخلوق کے ساتھ تعلق کی حد۔

کی یہ ہے کہ آج کل جن کی طرف مخلوق کا رجوع ہے ان میں باعتبار غیر ضروری تعلق رکھنے اور اس سے دلچسپی ہونے کے دو قسم کے لوگ ہیں ایک تو وہ جن کو مخلوق سے تعلق ہے اور تعلق میں انہماک بھی ہے مگر وہ بھی اس کو مستحسن (۱) نہیں سمجھتے گو مخلوق سے ملتے ہیں مگر دلی تقاضہ یہ ہے کہ کسی طرح یکسوئی نصیب ہو ان کی حالت تو غنیمت ہے اور ان کی اصلاح بھی آسان ہے کہ اگر زیادہ تعلق کی قباحت ان کو بتلادی جائے تو وہ جلدی مان لیں گے اور اگر تقلیل تعلق کا طریقہ ان کو بتلا دیا جائے تو وہ اس پر عمل کرنے کے لیے بھی تیار ہو جائیں گے کیونکہ اس تعلق کو وہ بھی مستحسن نہیں سمجھتے اور اس سے یکسوئی کے طالب ہیں صرف تدبیر نہ معلوم ہونے کی وجہ سے تقلیل (۲) نہیں کرتے اور ایک وہ لوگ ہیں جو تعلق مع الخلق کے ہر درجہ کو محمود (۳) اور مقصود اور دین سمجھتے ہیں ان کی اصلاح ذرا دشوار ہے (۴) کیونکہ جس چیز کو انسان دین سمجھے ہوئے ہیں اس سے ان کو ہٹانا آسان نہیں بہت مشکل ہے دوسرے یہ لوگ عملی غلطی کے ساتھ علمی غلطی میں بھی مبتلا ہیں اور پہلا طبقہ صرف عملی غلطی میں مبتلا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ خطاء علمی خطاء عملی سے اشد ہے اور آج کل دوسری ہی قسم کے لوگ زیادہ ہیں۔ تعلق مع الخلق بعض صورتوں میں مامور (۵) ہے۔ میں اس وقت انہی کو اس غلطی پر متنبہ کرنا چاہتا ہوں جس میں وہ مبتلا ہیں اور منشا اس غلطی کا یہ ہے کہ تعلق مع الخلق (۶) بعض صورتوں میں دین بھی ہے اور مامور بہ (۷) بھی ہے مگر ان لوگوں نے اس کو حکم کلی اور عام بنالیا ہے۔ حالانکہ وہ واقع میں قیود کے ساتھ مقید ہے۔

غیبت کے بارے میں غلط فہمی

اور یہ غلطی ایسی ہے جیسے ہم لوگوں نے یعنی اہل علم نے جواز غیبت کو عام

(۱) اچھا (۲) کمی (۳) مخلوق کے ساتھ تعلق کے ہر درجہ کو پسندیدہ اور مقصود سمجھتے ہیں (۴) مشکل (۵) بعض صورتوں میں مخلوق سے تعلق رکھنے کا حکم ہے (۶) مخلوق سے تعلق (۷) حکم دیا گیا ہے۔

کرلیا ہے۔ کیونکہ شریعت نے بعض وجوہ سے بعض مواقع پر اس کو جائز بھی کیا ہے اس کا کلیہ یہ ہے کہ جہاں کسی شخص کی حالت چھپانے سے دین کا یا دوسرے مسلمانوں کا یقیناً یا ظناً (جس سے ظن غالب مراد ہے) ضرر(۱) ہوتا ہو وہاں اس کی اصلی حالت ظاہر کردینا جائز ہے۔ اس میں محدثین کا روایت حدیث پر جرح کرنا اور مبتدع گمراہ کن(۲) کی بدعت کا ظاہر کرنا اور مستشار کو مستشار فیہ(۳) کی حالت کا مستشیر سے بیان کرنا اور مظلوم کا ظالم کی شکایت کرنا سب داخل ہے مگر عوام کو میں متنبہ کرتا ہوں کہ اس کلیہ کو وہ خود استعمال نہ کریں بلکہ جس کی وہ غیبت کرنا چاہیں اس میں پہلے علماء سے فتویٰ لیں اور عالم بھی ایسا ہو جو ایک درجہ میں مجتہد اور متدین ہو(۴) اجتہاد سے میری مراد یہ نہیں کہ وہ قرآن وحدیث میں اجتہاد کرسکتا ہو بلکہ یہ مراد ہے کہ فقہاء کے اقوال کو واقعات پر صحیح طور پر منطبق کرسکتا ہو اور یہ اجتہاد ابھی ختم نہیں ہوا بلکہ قیامت تک باقی رہے گا اور تدین سے مراد یہ ہے کہ اغراض کا تابع نہ ہو (یہ حاصل مطلب کا بیان ہے لغت کا بیان نہیں) کیونکہ جو شخص غرض کا تابع ہوگا وہ جائز کو ناجائز اور ناجائز کو جائز کرنے کی کوشش کرے گا اور اہل علم کے تو یہ بائیں ہاتھ کا کھیل ہے چنانچہ ہم رات دن دیکھتے ہیں کہ مولوی جس کی غیبت کرنا چاہتے ہیں کھینچ تان کر اسے حد جواز میں لے آتے ہیں کہ ہماری نیت اس غیبت سے دوسرے کی تحقیر نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کی اصلاح مقصود ہے تاکہ اس کے شر سے محفوظ رہیں یا اس کے معتقد نہ ہوں وغیرہ ذلک مگر یہ سب تاویلیں دنیا ہی میں چل جاتی ہیں حق تعالیٰ کے سامنے ان کا چلنا دشوار ہے کیونکہ وہ (اللہ رب العزت) عالم مافی الصدور ہیں(۵) دل کی نیتوں کو خوب جانتے ہیں کہ تمہارا مقصود شفاء غیظ(۶)

(۱) نقصان (۲) بدعتی گمراہ کنندہ (۳) مشورہ دینے والے کا مشورہ لینے والے کو جس چیز کے بارے میں وہ مشورہ مانگ رہا ہو اس کی حالت کا بتادینا (۴) دیندار (۵) دلوں کا حال جانتا ہے (۶) اپنے غصہ کو نکالنا۔

اور دوسرے کی تحقیر تھی یا مسلمانوں کی اصلاح کا قصد تھا۔

کارہا باخلق آری جملہ راست باخدا تزویر وحیلہ کے رواست(۱)

کارہا او راست باید داشتن رایت اخلاص وصدق افراشتن(۲)

تو جس طرح غیبت کو بعض مواقع میں جائز دیکھ کر ہم نے اس کو عام کرلیا اور اتنا عام کرلیا کہ اسی کو اوڑھنا اور بچھونا بنالیا ہے(۳) کہ کوئی مجلس ہماری غیبت سے خالی نہیں ہوتی اسی طرح تعلق مع الخلق کے بعض صورتوں میں مامور(۴) اور داخل دین ہونے سے ان حضرات نے دھوکہ کھایا کہ اس کو مطلقا محمود(۵) اور دین سمجھنے لگے حالانکہ وہ کلیتاً محمود نہیں بلکہ بعض افراد اس کے مکروہ(۶) وناجائز ہیں اور بعض افراد خلاف اولیٰ ہیں اور بعض افراد محمود ہیں۔

انتظار نماز بحکم نماز ہے

اس سے شاید بعض لوگوں کو خصوصاً ان کو جو تعلق مع الخلق کو مطلقاً محمود سمجھتے ہیں(۷) توحش(۸) ہوا ہوگا مگر توحش کی کوئی وجہ نہیں کیونکہ تعلق مع الخلق تو اگر کسی صورت میں داخل دین ہے بھی تو مقصود بالغیر اور محمود بالغیر ہوکر ہے جیسا کہ آئندہ واضح ہوگا اور میں آپ کو دکھلاتا ہوں کہ جو اعمال مقصود بالذات اور محمود بالذات بھی ہیں ان کے بھی سب افراد محمود نہیں ہیں مثلاً نماز ہی کو لیجئے جو محمود ومقصود بالذات ہے(۹) مگر اس کے بھی بعض افراد مکروہ وناجائز ہیں اور بعض خلاف اولیٰ ہیں۔ اگر کسی کو پیشاب وپاخانہ کا تقاضا ہو تو اس دباؤ کی حالت میں اس

(۱) ''مخلوق کے ساتھ تو تمام کام درست رکھتے ہو خدا کے ساتھ مکاری اور دھوکہ بازی کب جائز ہے'' (۲) ''اس کے ساتھ کاموں کو ٹھیک رکھنا چاہیے سچائی اور خلوص کا جھنڈا گاڑنا چاہیے'' (۳) ہر وقت اسی میں مشغول ہیں (۴) بعض صورتوں میں جو مخلوق کے ساتھ تعلق رکھنے کا حکم دیا گیا ہے (۵) ہر تعلق کو پسندیدہ سمجھا (۶) ناپسندیدہ (۷) مخلوق سے تعلق کو بالکلیہ پسند کرتے ہیں (۸) پریشانی ہوگی (۹) اپنی ذات میں پسندیدہ ہے۔

کو نماز پڑھنا مکروہ ہے اور اس وقت بول وتغوط لازم ہے(۱) تو کیا کسی وقت بول وتغوط کا مامور بہ ہونا اور نماز سے مقدم ہونا(۲) اس کو مقصود بالذات بنادے گا اور کیا آپ اس کو مقصود بالذات کہیں گے ہرگز نہیں بلکہ یہی کہا جائے گا کہ بعض جہات سے اور بعض عوارض کی وجہ سے مقصود بالغیر ہوگیا ہے فی نفسہ ہرگز مقصود نہیں اور وہ عارض کیا ہے جس کی وجہ سے تغوط نماز پر مقدم کیا گیا یہاں پر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ جیسے فقہاء کے مطابق محض روایت کافی نہیں کہ محض راویوں کی طرح حدیث بیان کئے جائیں اور علل احکام میں نظر نہ کریں گو ایک مسلک یہ بھی ہے مگر مسلک منصور یہی ہے (۳) کہ احکام غیر تعبدیہ کی علل میں غور کیا جائے تو امام صاحب نے ایک حدیث میں یہ دیکھا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ جب کھانا اور نماز مجتمع ہوجائیں اور تم کو بھوک کا تقاضا ہو تو کھانے کو مقدم کرو اور بعض فقہاء نے فرمایا ہے اگر نماز پڑھنے میں کھانے کی لذت میں فرق آنے کا اندیشہ ہو مثلاً ٹھنڈا مٹی ہوجائے گا تو جب بھی تقدیم طعام کی اجازت ہے (۴) مگر اس مسئلہ کو عام طور پر بیان کرنے کو جی نہیں چاہتا کیونکہ آج کل اہل ہوی زیادہ ہیں۔ نہ معلوم وہ اس سے کہاں کہاں کام لیں گے بہرحال بعض وقت میں شریعت نے طعام کو صلوٰۃ سے مقدم کردیا ہے امام صاحب سے اس کی وجہ میں منقول ہے۔ لان یکون اکلی کلہ صلوۃ احب الی من ان یکون صلوتی کلھا اکلا کہ میرا کھانا نماز بن جائے یہ اس سے اچھا ہے کہ نماز کھانا بن جائے۔ یعنی شریعت کا قاعدہ ہے کہ انتظار صلوٰۃ بحکم صلوٰۃ ہے تو جو شخص کھانا کھاتا ہو اور اس کا دل نماز کی فکر میں مشغول ہو تو وہ حکماً نماز ہی میں ہے اس طرح اس کا کھانا نماز بن گیا اور جو شخص

(۱) پیشاب پاخانہ کرنا ضروری ہے (۲) نماز سے پہلے پیشاب پاخانے سے فراغت کا حکم (۳) پسندیدہ مسلک (۴) کھانا پہلے کھانے کی اجازت ہے۔

نماز کی حالت میں کھانے کی فکر میں ہوتو وہ حکماً نماز کھانا بن جائے گی اس حکمت کی وجہ سے شریعت نے تقاضۂ بول وتغوط کے (۱) وقت قضاء حاجات کو نماز سے مقدم کیا اور نماز کو اس حالت میں مکروہ کہا ہے۔

سید الطائفہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے علوم کی شان

امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی نظیر میں ہمارے حاجی صاحب کا بھی ایک ارشاد ہے گو یہ ایک صوفی متاخر کا قول ہے مگر ان کے علوم سلف کے مشابہ ہیں حضرت سے جب کوئی دریافت کرتا کہ میں مکہ مکرمہ میں اقامت کرلوں اس کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے تو فرماتے جس کا حاصل یہ تھا۔

بہند وستان بودن و دل بمکہ بہ ازاں کہ بمکہ بودن و دل بہند وستان یعنی ہندوستان میں اس حال سے رہنا کہ دل مکہ کے اشتیاق میں ہو یہ اس سے اچھا ہے کہ مکہ میں اس حال میں رہو کہ دل ہندوستان میں اٹکا ہوا ہو۔ مطلب یہ تھا کہ مکہ میں قیام کا اس وقت ارادہ کیا جائے جبکہ یہ حالت نصیب ہوجائے کہ یہاں رہ کر پھر ہندوستان یاد نہ آئے گا اور جس کو یہ حال نصیب نہ ہو اس کے لیے ہندوستان میں قیام کرنا اور مکہ کی یاد میں تڑپتے رہنا ہی بہتر ہے کیونکہ اس شخص کو جب یہ حال نصیب نہیں تو اندیشہ سقوط حرمت کعبہ کا ہے کہ مکہ میں قیام کرنے سے اس کو کعبہ کے ساتھ ضعف تعلق کی حالت ہوجائے گی کہ اب نظر میں پہلی سی عظمت ووقعت نہ رہے گی۔ اسی حکمت کی وجہ سے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی عادت تھی کہ حج کے بعد لوگوں کو مکہ سے نکالتے تھے اور فرماتے تھے: (یا اھل الشام شامکم ویا اھل الیمن یمنکم) الخ اے شام والو! تم شام کو جاؤ اور اے اہل یمن تم یمن کو سدھارو (اور فرماتے ھذا ابقی

(۱) پیشاب پاخانے کے تقاضے کے وقت اس کو نماز پر مقدم کیا۔

لحرمة البیت فی قلوبهم اونحوه ، کہ اس سے ان کے قلوب میں حرمت بیت زیادہ بڑھے گی) تو دیکھئے حالانکہ فی نفسہٖ قیام حرم افضل واولیٰ اور محمود ومقصود ہے مگر ایک عارض کی وجہ سے ہندوستان ویمن وشام میں رہنا مامور بہ ہوگیا(۱) اور بعض حالات میں قیام حرم سے بھی مقدم ہوگیا ان سب مثالوں سے یہ معلوم ہوگیا ہوگا کہ کسی عارض کی وجہ سے مقصود بالغیر کبھی مقصود بالذات سے بھی مقدم ہوتا ہے مگر وہ مقصود بالذات نہیں بن جاتا صرف تقدم زمانی ہوجاتا ہے اور یہ طغرہ ہے(۲) کہ شئی متاخر بدون معیت کے اپنے متقدم سے مقدم ہوگئی (۳) مگر اس سے انقلاب حقیقت نہیں ہوتا کہ مقصود بالغیر مقصود بالذات، اور مقصود بالذات مقصود بالغیر ہوجائے ہرگز نہیں کیونکہ انقلاب حقیقت بلادلیل بلکہ خلاف دلیل ہے جس طرح حکماء حرکت اجسام میں طغرہ کے قائل ہوئے ہیں اسی طرح یہ معانی میں طغرہ ہے۔ اسی طرح تعلق بالخلق مقصود بالذات نہیں ہے بلکہ مقصود بالغیر ہے۔

آیت متلوکا مدلول

اور کبھی کبھی جو کسی عارض کی وجہ سے مقصود بالذات پر اس کی قدیم کا امر ہوا ہے۔ اسی سے بعض اہل علم کو اس میں مقصودیت ذاتیہ کا شبہ ہوگیا ہے اور وہ اس کو عین دین سمجھنے لگے چنانچہ اب اس غلطی کی وجہ سے عام حالت یہ ہے کہ نماز روزہ سے فارغ ہوئے اور تعلق بالخلق میں مشغول ہوگئے فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ، کی تفسیر کو بالکل الٹ دیا گیا کہ حکم تو یہ تھا کہ مخلوق کے کام سے فارغ ہوکر تعلق بالحق میں زیادہ مشغول ہونے کی کوشش کی جائے اور یہاں حالت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے فارغ

(۱) حرمت حرم کے باقی رکھنے کی وجہ سے شام ویمن میں رہنا بھی افضل ہوگیا (۲) یہ امتیاز ہے (۳) جو کام بعد میں کرنا چاہئے تھا عارض کی وجہ سے اپنے سے، پہلے کئے جانے والے کام سے بھی پہلے کرنے کا اس کو حکم دیا گیا۔

ہوکر تعلق بالخلق میں مشغول ہونے کی کوشش ہے آیت کا مدلول تو یہ تھا کہ اشتغال بالحق کے لیے مخلوق سے فراغ ڈھونڈا جائے اور ہماری حالت یہ ہے کہ اشتغال بالخلق کے لیے حق تعالیٰ سے فراغ کو ڈھونڈتے ہیں پہلی حالت کا مقتضا یہ تھا کہ تعلق بالخلق میں دلچسپی نہ ہوتی بلکہ مخلوق کے ساتھ اشتغال کے وقت میں یہ بے چینی ہوتی کہ جلدی سے ان سے فارغ ہوکر سارا وقت خدا کے ساتھ تعلق بڑھانے میں صرف کیا جائے اور دوسری حالت کا اثر یہ ہے کہ ہم نماز روزہ سے ذکر وتلاوت سے جلدی جلدی فارغ ہونے کی کوشش کرتے اور باقی سارے وقت میں اشتیاق ودلچسپی کے ساتھ تعلق خلق میں مشغول ہوجاتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ ہے کہ عین نماز میں بھی تعلق بالخلق کا دھیان لگا رہتا ہے۔

قرآن پاک کی اقصر آیات

اسی لیے نماز میں چھوٹی چھوٹی سورتیں قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ پڑھتے ہیں یہ بھی اللہ تعالیٰ کی ہمارے حال پر رحمت وعنایت ہے کہ قرآن میں چھوٹی چھوٹی سورتیں بھی نازل فرمادیں تاکہ فاتحہ کے بعد جو ایک سورت واجب ہے اور وہ واجب چھوٹی سورتوں کے پڑھنے سے بھی ادا ہوجائے پھر امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو دعا دو کہ انہوں نے اپنے اجتہاد سے یہ مسئلہ مستنبط کیا کہ فاتحہ کے بعد سورت ہی کا پڑھنا ضروری نہیں بلکہ تین آیات بھی کافی ہیں۔ کیونکہ اقصر سورت کی آیات تین ہی ہیں پھر یہ بھی ضروری نہیں کہ تین آیات اِنَّآ اَعْطَيْنَا کی آیات کے برابر ہی ہوں بلکہ اقصر آیات بھی کافی ہے پھر اللہ تعالیٰ فقہاء متاخرین کو جزائے خیر دے کہ انہوں نے سارے قرآن کی آیات کو دیکھ کر سورۃ مدثر کی تین آیتیں تلاش کیں جو بہت چھوٹی چھوٹی ہیں جن کے اٹھارہ ہی حرف ہیں اور انہوں نے فتویٰ دے دیا کہ فاتحہ کے بعد اٹھارہ حرفوں کی مقدار قرآن پڑھنے سے واجب ادا

ہوجائے گا چاہے پوری آیت بھی نہ ہو بلکہ آیت کا جزو ہی ہو شاید اب تو بعضوں کو اِنَّآ اَعْطَیْنَا میں بھی دو رکعتیں کرنے کا خیال ہوا ہوگا۔ بعض جہل بھی نافع ہوتا ہے(۱) لوگوں کو اب تک اس مسئلہ کی خبر نہ تھی اس لیے وہ انا اعطینا سے کم میں نماز کو صحیح نہ سمجھتے تھے مگر اب تو علم ہوگیا شاید اب اس سے بھی کم کی نیت ہوئی ہوگی لیکن ہمارا کیا حرج ہے ممکن ہے اس سہولت کو سن کر کوئی بے نمازی نماز ہی پڑھنے لگے کہ یہ تو بہت آسان چیز ہے اس میں تو وقت بھی زیادہ نہیں لگتا اور فقہاء نے ایسے ہی لوگوں کی رعایت سے اتنی مخنتیں کی ہیں تاکہ اگر کوئی لمبی نماز سے گھبراتا ہو تو اسے بتلاسکیں کہ فرض وواجب کا ادا ہونا تطویل پر موقوف نہیں وہ تو اختصار سے بھی ادا ہوسکتا ہے اور بعض دفعہ اختصار کی ضرورت بھی ہوتی ہے کہ اس وقت تطویل (۲) مکروہ ہوجاتی ہے اور اختصار ہی مطلوب ہوتا ہے مثلاً نماز کا وقت تنگ ہوگیا ہو تو اب لازم ہے کہ فرائض وواجبات ہی پر اکتفا کیا جائے اور سنن کو حذف کیا جائے۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ اور امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی حکایت

میں نے ایک معتبر عالم سے سنا ہے کہ ایک دفعہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ وامام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ سفر میں تھے۔ اونٹ کی سواری تھی جو بہت آرام کی سواری ہے۔ کچھ تو آرام ملنے کی وجہ سے کچھ تعب سفر کی وجہ سے سواری ہی کی حالت میں نیند کا ایسا غلبہ ہوا کہ صبح دیر میں آنکھ کھلی، پہلے میں اس (اونٹ کی سواری) سے بہت ڈرا کرتا تھا کیونکہ بچپن میں ایک بار اس پر سوار ہوا تھا تو وہی تصور ذہن میں تھا کہ وہ بہت لمبا تھا اور میں بہت چھوٹا تھا گو اب وہ تصور تو عقلاً نہ رہا مگر اس کا اثر یعنی خوف طبعاً باقی تھا مگر جب میں سفر میں گیا اور بعض مقامات میں اونٹ کی سواری تجویز کی تو میں نے اول انکار کیا کہ مجھے تو اس سے ڈر لگتا ہے انہوں نے کہا آپ سوار

(۱) بعض جہل بھی مفید ہے (۲) لمبی قرأت۔

ہوکر تو دیکھیں یہ تو بہت آرام کی سواری ہے اس وقت میں ان کے کہنے سے سوار ہوا تو میرا خوف زائل ہوگیا اور معلوم ہوا کہ واقعی بہت آرام کی سواری ہے غرض کچھ تو سواری آرام کی تھی اور کچھ سفر میں وقت پر سونے کا موقع نہیں ملتا اس لیے ان حضرات کی آنکھ صبح کو دیر میں کھلی، جلدی سے اتر کر وضو کیا اور امام صاحب نے اپنے شاگرد امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو نماز میں آگے بڑھادیا انہوں نے اپنے اجتہاد سے کام لے کر نماز میں بہت اختصار کیا کیونکہ وقت بہت کم رہ گیا تھا راوی کو یہ یقینی یاد تھا کہ انہوں نے سنن کو ترک کردیا اور اس میں شبہ بیان کیا تھا کہ واجبات کو بھی ترک کیا اور محض فرائض ہی پر اکتفا کیا تھا یا واجبات ترک نہیں کئے غرض بہت ہی جلدی دو رکعتیں پڑھ کر سلام پھیر دیا اور دل دل میں ڈر رہے تھے کہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نماز کے بعد اس تعجیل سے خفا نہ ہوں مگر امام صاحب نے نماز کے بعد فرمایا الحمد للّٰہ صار یعقوبنا فقیھا، خدا کا شکر ہے کہ ہمارا یعقوب (امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کا نام ہے) فقیہ ہوگیا، جس فعل سے ان کو گرفت کا اندیشہ تھا اسی نے ان کو استاد کی زبان سے فقیہ کا خطاب دلوادیا اور جس کو امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ فقیہ کہہ دیں سمجھ لو وہ کس درجہ کا فقیہ ہوگا میں اسی کو بیان کررہا تھا کہ بعض دفعہ اختصار ہی مطلوب ہوجاتا ہے اور تطویل مکروہ ہوجاتی ہے اور اس کی رعایت کرنا فقیہ ہی کا کام ہے۔ نرا صوفی اسکی رعایت نہیں کرسکتا اور جاہل تو بھلا کیا خاک رعایت کریں گے چنانچہ بہت لوگ طلوع آفتاب سے پہلے اٹھ جاتے ہیں۔ مگر علم نہ ہونے کی وجہ سے نماز کو قضاء کردیتے ہیں ان کی تو نیت ہی اتنی دیر میں بندھتی ہے کہ جاننے والا اس میں ایک رکعت پڑھ لے۔

امامت میں کون افضل ہے

ایک دفعہ میں شاہ جانپور میں گیا تھا واپسی کے وقت اسٹیشن پر مغرب کی

نماز پڑھی جو عین گاڑی آنے کا وقت تھا۔ مجمع میں ایک قاری صاحب بھی تھے میں نے ان کو امامت کے لیے آگے کیا کیونکہ حدیث میں ہے یَؤُمُّ الْقَوْمَ اَقْرَأُھُمْ (۱) مگر اس بندہ خدا نے قرأت میں ترتیل سے بڑھ کر ترسیل شروع کردی اس وقت میری طبیعت کو بہت الجھن ہوئی اور بار بار یہ خیال ہوتا تھا کہ اب گاڑی آئی، بڑی دقت سے نماز پوری کی خیر شکر ہے کہ گاڑی آنے سے کچھ پہلے ہی ختم ہوگئی تھی۔ اس دن میں سمجھا کہ امام صاحب نے جو اقرأھم کی تفسیر اعلمھم (ان میں زیادہ مسائل کا علم رکھنے والا ہو) سے کی ہے واقعی وہ صحیح سمجھے ہیں کہ نماز میں اعلم ہی کو امام بنانا چاہیے۔ (گو اقراء نہ ہو مگر بقدر ضرورت صحیح قرآن پڑھتا ہو) نرا قاری تو بعض دفعہ نماز کو فاسد کردے گا۔ اب نرے صوفیوں کی حالت سنیئے۔ ایک دفعہ ایک بزرگ کے ساتھ میرا سفر ہوا بہلی (۲) کا سفر تھا راستہ میں مغرب کا وقت آگیا۔ بہلی ٹھہرا کر نماز مغرب پڑھی میں تو فرض کے بعد دو سنتیں پڑھ کر کھڑا ہوگیا اور ان بزرگ نے ایسی صلوۃ الاوابین (۳) شروع کردی جو میرے لیے ایسی صلوۃ الاوابین ہوگئی کہ آئندہ کے لیے میں نے ایسے بزرگوں کے ساتھ سفر کرنے سے توبہ کرلی یہ وقت صلوۃ الاوابین کا تھا کہ راستہ میں رات ہوگئی اور ساتھیوں کو پریشانی ہورہی ہے ادھر گاڑی بان کو جلدی ہے کہ کس طرح بیلوں کو منزل پر پہنچ کر جلدی سے گھاس دانہ مل جائے پھر رات کو سفر میں بھی خطرہ ہوتا ہے اور وہ مقام خطرہ کا مشہور بھی تھا اور یہ حضرت اپنی صلوۃ الاوابین کی وجہ سے سب کو باندھے ہوئے ہیں۔

ایک دوسرے بزرگ کے سفر کا واقعہ ایک شخص نے مجھ سے بیان کیا کہ

(۱) ''لوگوں کی امامت وہ کرے جو ان میں قرآن پاک زیادہ قرأت سے پڑھتا ہو'' (سنن ابی داؤد ۵۸۲، سنن النسائی: ۲/۷۶) (۲) بیل گاڑی (۳) مغرب کی نماز کے بعد چھ سے لیکر بیس رکعت تک نفل پڑھنے کو صلوٰۃ الاوابین کہتے ہیں۔

راستہ میں ظہر کا وقت آ گیا ہمراہی نماز سے فارغ ہوکر تیار ہوگئے مگر وہ بزرگ مصلیٰ سے نہ اٹھے ان سے کہا گیا تو جواب دیا کہ میں تو ظہر کے بعد عصر تک مصلیٰ ہی پر بیٹھ کر وظیفہ پڑھا کرتا ہوں اب ایک شخص کی وجہ سے سب ساتھیوں کو دو تین گھنٹہ تک مقید رہنا پڑا اور دل میں سب تنگ تھے۔ تو ایسے مواقع پر تطویل کرنا تو جہالت ہے مگر اطمینان واقامت کی حالت میں زیادہ اختصار کرنا اچھا نہیں۔

تعلق مع الخلق مقصود بالذات نہیں

لیکن ہم لوگ اختصار کے ایسے عادی ہوئے ہیں کہ ہمیشہ ''قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ'' اور ''اِنَّآ اَعْطَيْنَا'' ہی سے نماز پڑھتے ہیں اور یوں چاہتے ہیں کہ جلدی نماز سے فارغ ہوکر دوستوں کے ساتھ بات چیت میں مشغول ہوں جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ہم نے تعلق بالخلق کو مقصود بالذات (۱) اور مطلوب سمجھ لیا ہے پس خوب سمجھ لو کہ تعلق مع الخلق مقصود ومطلوب بالذات نہیں ہے گو بعض دفعہ کسی عارض کے سبب مطلوب ومامور بہ (۲) ہوتا ہے اور کبھی مطلوب بالذات سے مقدم بھی ہوجاتا ہے مگر اسکو قاعدہ کلیہ بنالینا سخت غلطی ہے بلکہ اس کے سمجھنے کے لیے اجتہاد کی ضرورت ہے محض کتابیں پڑھ لینا کافی نہیں۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند
ہزار نکتۂ باریکتر زمو ایں جاست نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند (۳)

نوجوان علماء کو ایک ضروری نصیحت

اس لیے میں نوجوان مولویوں سے کہا کرتا ہوں کہ گو تم عالم ہوگئے ہو

(۱) مخلوق کے ساتھ تعلق کو مقصود حقیقی سمجھ لیا ہے (۲) بعض مرتبہ کسی عارض کی بنا پر اس کا حکم دیا جاتا ہے اور وہ مطلوب ہوتا ہے (۳) ''جس نے اپنے چہرہ کو روشن کیا وہ دلبری کے لائق نہیں ہر آئینہ رکھنے والے کو سکندر نہیں کہہ سکتے اس جگہ ہزار نکتہ بال سے باریک ہیں ہر وہ شخص کہ سر منڈالے قلندر نہیں بن سکتا''۔

اورتمہاری معلومات بھی تازہ ہیں اور پرانے مولویوں سے زیادہ بھی ہیں کیونکہ جوانوں کا حافظہ اچھا ہوتا ہے مگر پھر بھی ابھی تک تم کو اس کی ضرورت ہے کہ کسی بڈھے کے پاس رہو جبھی تم کو معانی حاصل ہوں گے۔ کیونکہ بزرگوں کی صحبت میں رہنے سے ان کی فہم صائب(۱) ہوچکی ہے اور اگر کسی نوجوان کو معانی بھی الفاظ کے ساتھ القا ہوتے رہتے ہوں تو اس کو بھی کسی کامل کی شہادت کی ضرورت ہے بدون کسی کامل کی شہادت کے اپنے آپ کو مجتہد سمجھنے کا اسے بھی حق نہیں صائب نے خوب کہا ہے۔

بنمائے بصاحب نظرے گوہر خودرا عیسی نتواں گشت بتصدیق خرے چند(۲)

یہ شعر اس شخص پر بہت اچھا صادق ہورہا ہے جس نے چند گدھوں کی تصدیق سے عیسی ہونے کا دعویٰ کیا تھا(۳)۔ بہرحال اگر کسی کو الفاظ کے ساتھ معانی کا بھی القا ہوتا ہو تو اسے بھی از خود اپنے اجتہاد کا معتقد ہوجانا جائز نہیں جب تک کوئی مجتہد اس کے اجتہاد پر شہادت نہ دے دے اور کامل کی شہادت کے بعد اسے اپنی فہم کو موقع فہم (۴) میں حجت سمجھنا جائز ہوگا اور یہ تکبر میں داخل نہ ہوگا بلکہ اس کی ایسی مثال ہے جیسے کوئی بی اے اپنے کو بے اے سمجھے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بعضے انگریزی پڑھنے والے لیاقت واستعداد میں اپنے اساتذہ سے بڑھ جاتے ہیں مگر پھر بھی وہ بی اے خود نہیں ہوسکتے جب تک کوئی مبصر شہادت نہ دے۔ حالانکہ وہاں کبھی مبصر خائن بھی ہوتا ہے پھر بھی اس کی شہادت سے آپ بی اے ہوجاتے ہیں اور اپنے کو بی اے سمجھنے لگتے ہیں اور اگر وہ شہادت نہ دے تو چاہے آپ کتنے ہی لائق وفاضل ہوں مگر بی اے فیل ہی رہیں گے تو جہاں مبصر متدین (۵) ہو وہاں اس کی شہادت سے اپنے کو مجتہد سمجھنا کیونکر جائز نہ ہوگا۔

---

(۱) ان کی رائے درست ہوچکی ہے (۲) ''اپنے موتی کو کسی نظر والے کو دکھلا چند بیوقوف لوگوں کے کہنے سے عیسی نہیں بن سکتا'' (۳) غلام احمد قادیانی (۴) اپنی سمجھ سے جہاں اس سمجھداری کی ضرورت ہو کام لینا درست ہوگا (۵) دیندار۔

تکبر کی حقیقت

دوسری نظیر اس سے بہتر یہ ہے کہ جیسے حافظ کو اپنے حفظ کا اعتقاد جائز ہے ایسے ہی اس شخص کو اپنے اجتہاد کا اعتقاد جائز ہے۔ اور یہ تکبر نہیں بلکہ تکبر یہ ہے کہ اپنی صفات حمیدہ کو اپنا کمال سمجھے عطاء وفضل حق پر نظر نہ کرے۔ اور دوسروں کو حقیر سمجھے۔ باقی اپنی صفات کی نفی کرنا تواضع نہیں ہے الٰہ آباد میں ایک بزرگ محمدی شاہ تھے جو ولایتی تھے اسی لیے ان کی زبان کھڑی تھی۔ ایک میرے دوست بیان کرتے تھے جو حافظ اور حاجی بھی تھے کہ میں ان کی خدمت میں ایک شخص کے ساتھ گیا جن کو محمدی شاہ صاحب پہلے سے پہچانتے تھے۔ شاہ صاحب نے ان سے پوچھا یہ کون صاحب ہیں؟ اس شخص نے کہا کہ حضرت ان کا یہ نام ہے اور یہ حافظ بھی ہیں اور حاجی بھی ہیں اور بہت نیک ہیں اس پر وہ حافظ صاحب بولے نہیں حضرت میں تو کچھ بھی نہیں اس لفظ پر محمدی شاہ صاحب برہم ہوگئے اور جھلا کر فرمایا تو اچھا! تم حافظ نہیں تو یہ چاہتا ہے کہ تمہارا حفظ سلب ہوجائے۔ تمہارا حج ضبط ہوجائے اور تمہارا نماز روزہ خبط ہوجائے۔ کہا، نہیں! فرمایا۔ پھر یوں کیوں کہتے ہو کہ میں تو کچھ بھی نہیں تو ناشکرا ہے اور اس کے بعد جب کبھی یہ حافظ صاحب ان سے ملتے تو فرماتے آؤ ناشکرا مجھے یہ بات ان کی بہت پسند آئی کہ انہوں نے بتلا دیا کہ تواضع کے یہ معنی نہیں کہ خدا تعالیٰ نے جو نعمتیں عطا فرمائی ہیں ان کی اپنے سے نفی کرے بلکہ معنی یہ ہیں کہ ان کو اپنے کمال سے نہ سمجھے محض فضل ورحمت سمجھے پس اب میرا قول واضح ہوگیا کہ کامل کی شہادت کے بعد اپنے اجتہاد کا اعتقاد جائز ہے اور بدون اس کے جائز نہیں مگر اب یہ حالت ہے کہ لوگ محض اپنے خیال اجتہاد سے تعلق مع الخلق کو مطلقاً محمود ومقصود سمجھتے ہیں حالانکہ یہ کلیہ (۱) غلط ہے بلکہ بعض دفعہ عارض کی وجہ

(۱) یہ قاعدہ غلط ہے۔

سے مقصود بالغیر ہوجاتا ہے۔

تعلق مع الخلق کا معیار

اب میں آپ کو ایک معیار بتلاتا ہوں جس سے معلوم ہوجائے گا کہ تعلق مع الخلق کو مطلوب کون سمجھتا ہے اور کون نہیں سمجھتا اور وہی تعلق مع الخلق کے محمود و مذموم ہونے کا معیار بھی ہے وہ یہ کہ اگر کسی کو دوستوں کے ساتھ باتوں میں مشغول ہونے سے دلچسپی نہ ہو بلکہ اس سے اس کا جی گھبراتا ہو اور نماز و ذکر میں مشغول رہنے کو جی چاہتا ہو اور باتوں میں مشغول ہوتے ہوئے یہ تقاضا ہو کہ جلدی سے بات ختم ہو تو میں اللہ کی یاد میں لگوں تو یہ شخص واقعی تعلق مع الخلق کو مطلوب نہیں سمجھتا اور اس کے لیے اس تعلق کو مذموم نہ کہا جائے گا اور جس شخص کا نماز میں یہ جی چاہتا ہو کہ جلدی نماز سے فارغ ہوکر دوستوں سے باتیں کریں اور ان کی باتوں کی وجہ سے اپنے معمولات کا ناغہ کردیتا ہو کہ نہ اشراق ہے نہ تہجد ہے نہ ذکر ہے نہ تلاوت ہے ان کی وجہ سے محض فرائض پر اکتفا کرتا ہے اور اس سے بھی جلد فارغ ہونے کا تقاضا ہے تو یہ شخص تعلق مع الخلق کو مطلوب سمجھتا ہے اور اس کے لیے یہ تعلق مذموم (۱) ہے۔ یہ ہے معیار اس کو یاد رکھیں گے مگر بلی کے بھاگو چھینکا ٹوٹا ان لوگوں کو بعض بزرگوں کی کچھ حکایات پہنچی ہیں اور اس کے ساتھ چند کتابیں بھی پڑھ لی ہیں اس لیے ہر بات میں تاویل کرتے ہیں اور اپنے فعل کو بزرگوں کے فعل پر قیاس کرکے سرخرو بنتے ہیں۔

نوچندی کا میلہ

تاویل تو طالب علمی ہی کے وقت سے ان کی گھٹی میں پڑ جاتی ہے مجھے خود اپنا واقعہ یاد ہے جب میں دیوبند پڑھتا تھا۔ اس وقت والد صاحب میرٹھ میں لال

(۱) برا ہے۔

کرتی والوں کے یہاں ملازم تھے۔ تعطیل کے موقع پر میں اکثر میرٹھ ہی چلا جایا کرتا تھا چنانچہ میں ایک دفعہ تعطیل کے زمانہ میں میرٹھ آیا تو اس وقت نوچندی کا میلہ تھا۔ پہلے تو یہ عرس تھا کسی بزرگ کا مگر اب بازار ہوگیا ہے۔ اور بازار بھی انگریزی، اس وقت میرا بچپن تھا سیر کی غرض سے میں نوچندی میں چلا گیا اور اب تو پچپن سالہ میں ہوں مگر اب بھی یہ حال ہے۔

چہل سال عمر عزیزت گذشت مزاج تو از حال طفلی نگشت(۱)

بلکہ دوسرے شعر کا مصداق ہے۔

اے کہ پنجاہ رفت ودرخوابی مگر ایں پنج روز دریابی(۲)

بہرحال اس وقت میری بہت تھوڑی عمر تھی ابتدائی کتابیں یا متوسطات پڑھتا تھا۔ جب میں نوچندی سے واپس آیا تو رئیس صاحب نے جو مجھ سے بہت محبت کرتے تھے جتلانے کے لیے پوچھا کیوں مولوی صاحب نوچندی میں جانا کیسا ہے۔ مولوی کا خطاب بھی مولویوں کو طالب علمی ہی سے مل جاتا ہے۔ میزان پڑھنے والا بھی مولوی کہلاتا ہے میں سمجھ گیا کہ یہ سوال مجھ پر اعتراض کرنے کے لیے کیا گیا ہے تو میں نے جواب دیا کہ عوام کو تو ناجائز ہے مگر ایسے شخص کو جائز جو کبھی مقتدا ہونے والا ہے اور وہ تحقیق حال کی غرض سے جاتا ہے، تاکہ بعد میں جب عوام کو اس سے منع کرے تو اس کے قبائح ومنکرات ان کے سامنے بیان کرسکے۔ رئیس صاحب کہنے لگے کہ مولوی جو کام بھی کرتے ہیں اس کو عبادت بنالیتے ہیں تو یہ بھی تاویل تھی کیونکہ طالب علمی ہی سے ہم لوگوں کو تاویل کا مرض ہوجاتا ہے۔ اسی طرح اب بھی بعض لوگ اپنی حالت میں تاویلیں کرتے ہیں اور اپنے کو بزرگوں پر قیاس کرتے

(۱) ''تیری پیاری عمر کے چالیس سال گزر گئے تیرے مزاج میں اب بھی لڑکپن باقی ہے'' (۲) ''اے وہ شخص کہ تیری عمر کے پچاس برس گزر گئے اور تو سو ہی رہا ہے شاید موجودہ پانچ روز پالیوے''۔

ہیں اور ان کی حکایات کو اپنی تائید میں بیان کر دیتے ہیں کہ وہ بھی تو تعلق مع الخلق کا اہتمام فرماتے اور دوسروں کی خاطر سے اپنے معمولات کو ناغہ کر دیتے تھے۔

دوسروں کی دلجوئی بھی عبادت ہے

مثلاً حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی ایک حکایت میں نے اپنے بچپن کے استاد سے سنی ہے کہ ایک دفعہ وہ دیر تک حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس بیٹھے رہے پھر اٹھتے ہوئے عرض کیا کہ حضرت آج میں نے حضرت کی عبادت کا بہت حرج کیا تو فرمایا کیا عبادت صرف نفلیں ہی پڑھنے کا نام ہے دوستوں کی دلجوئی اور ان کے ساتھ باتیں کرنا بھی تو عبادت ہے۔ یہ حکایت ہم لوگوں کے لیے مضر ہوگئی کہ ہم اپنی حالت کو بھی حاجی صاحب کی حالت پر قیاس کر کے دوسروں کی دلجوئی کو مطلقاً عبادت سمجھنے لگے اور اس کے لیے اپنے معمولات کو برباد کرنے لگے۔ صاحبو! حضرت حاجی صاحب کی حالت کو دوسرے واقعات سے سمجھو کہ وہ کس مقام پر تھے کیونکہ واقعات ہی سے قلبی حالت کا پتہ چلتا ہے۔ چنانچہ ایک بار حضرت کی مجلس میں تذکرہ ہو رہا تھا کہ جمعہ وعید کے دن عطر کس نیت سے لگانا چاہیے۔ ہر ایک نے مختلف وجوہ بیان کیں۔ حاجی صاحب نے فرمایا کہ ہم تو اس نیت سے لگاتے ہیں کہ اللہ میاں کو اچھے لگیں۔ یہ بات میں نے اور کسی بزرگ کے کلام میں نہیں دیکھی۔ مگر آج کل ہی ایک حدیث سے اس مضمون کی تائید ملی جس کی تخریج عراقی نے کی ہے جس میں من تطیب اللّٰہ (المغنی عن حمل الأسفار للعراقی ٤:٣٥٣) وارد ہے کہ جو اللہ کے واسطے خوشبو لگائے (اس کے لیے اجر ہے جو حدیث میں مذکور ہے) گو اس کی تفسیر میں اختلاف ہو سکتا ہے کوئی یہ تاویل بھی کر سکتا ہے۔ من تطیب لامتثال امر اللہ ونحوہ[1] مگر ظاہر

(۱) جو حکم الٰہی کی بجا آوری کے لیے خوشبو لگائے۔

حدیث حاجی صاحب کے قول کا مؤید ہے(۱) اس سے میرا بڑا جی خوش ہوا حضرت کے ارشاد کا حاصل یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہ کا علم واقع کے مطابق ہے اور عطر واقع میں اچھی چیز ہے تو علم الٰہی میں بھی یہ اچھی شے ہے تو ہم اس واسطے لگاتے ہیں تا کہ اللہ میاں کو اچھے لگیں۔

تمام عالم کو مرأۃ جمال حق سمجھنا

یہاں سے حضرت کی حالت کا پتہ چلتا ہے کہ حضرت کی نظر ہر چیز پر حضرت حق کے بعد ہی پڑتی تھی۔ یعنی ہر چیز سے اول حضرت حق پر نظر پہنچتی تھی۔ پھر اس چیز پر نظر پڑتی تھی۔ تمام عالم حضرت کے لیے مرأۃ جمال حق تھا(۲) پھر حضرت کے جو مجاہدات منقول ہیں ان کو بھی دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ آپ نے محبت حق کے لیے کیا کیا محنتیں برداشت فرمائی ہیں۔ دنیا سے کس قدر اعراض فرمایا ہے۔ تو جو شخص دنیا سے اس درجہ نفور ہو(۳) ظاہر ہے کہ دوستوں کی دلجوئی میں اس کی نیت دنیا کے لیے تو کبھی نہیں ہوسکتی بلکہ محض رضاء حق مطلوب تھی۔ اب جو لوگ اپنے کو حضرت پر قیاس کرتے ہیں وہ اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھیں تو کیا ان کو بھی دنیا سے اس درجہ نفرت ہے اور کیا ذات حق کے سوا ہر چیز سے ان کی نظر اٹھ گئی ہے اگر یہ بات نہیں تو پھر یہ قیاس مع الفارق(۴) کیسا حضرت کی ایک حکایت سنئے ایک مرتبہ حضرت حاجی صاحب کے یہاں مثنوی کا درس ہو رہا تھا اسی وقت ایک سائل آیا اور حضرت کی تقریر منقطع ہوگئی۔ کسی نے کہا لوگ کیسے بیوقوف آتے ہیں حضرت نے فرمایا خبردار! سائل سے کبھی تنگدل نہ ہونا یہ تو محسن ہیں ہمارے لیے حمال اثقال ہیں کہ ہمارا بوجھ اٹھا کر آخرت میں پہنچاتے ہیں اگر یہ لوگ نہ ہوں

(۱) حدیث کے ظاہری الفاظ سے حاجی صاحب کے قول کے تائید ہوتی ہے (۲) تجلیات الٰہی کے ظہور کا آئینہ تھا (۳) اتنا بھاگتا ہو (۴) پھر ان پر خود کو قیاس کرنا درست نہیں۔

تو ہمارے صدقات آخرت میں کسی طرح نہ پہنچ سکیں اس میں اشارہ تھا اس حدیث کی طرف جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آخر زمانہ میں مال کی اس قدر کثرت ہوگی کہ آدمی اپنے صدقہ کو لئے لئے پھرے گا اور کوئی اسے قبول نہ کرے گا کیونکہ کوئی فقیر ہی نہ ہوگا ہر شخص یہ جواب دے گا کہ اگر کچھ پہلے لے آتے تو میں قبول کر لیتا باقی اب تو خدا نے مجھے غنی کر دیا ہے اب بتلائیے اس وقت کیا حال ہوگا اور جو لوگ صدقہ کرنا چاہیں گے اور کوئی قبول کرنے والا نہ ملے گا تو ان کے دل پر کیا گزرے گی۔ اس لیے ہم کو سائلوں کا احسان مند ہونا چاہیے کہ جب تک یہ موجود ہیں اس وقت تک ہم کو صدقات کے پہنچانے میں سہولت ہے۔ اب اگر وہ قبول صدقہ کے عوض میں ہم سے کچھ اجرت بھی مانگیں تو بجا ہے۔

بعض پیرزادوں کی حکایت

جیسا کہ بعض پیرزادوں کی حکایتیں سنی ہیں کہ جو کوئی ان کی دعوت کرتا ہے تو دعوت کے بعد وہ دانت گھسائی بھی لیتے ہیں چنانچہ ایک پیرزادے سے ڈھاکہ کے ضلع میں ایک مقام پر جس کا نام زنجیرا ہے پہنچے اور وہاں جا کر زنجیر ہوس(۱) میں جکڑے گئے۔ کیونکہ وہاں ان کے باپ کے مرید تھے خود ان کے مرید بھی تھے خیر وہ ایک رئیس کے یہاں مہمان ہوئے اس نے چلتے ہوئے پچاس روپے پیش کئے آپ نے وہ پھینک دیئے اور کہا کیا ہم پچاس کے لائق ہیں اس نے معذرت کی کہ میں اس وقت زیادہ پیش کرنے سے مجبور ہوں مگر اس نے ایک نہ سنی آخر کار دو سو پر صلح ہوئی یہ دانت گھسائی تھی خیر اب تو سب لوگ اس حرکت پر ملامت ونفریں کرتے ہیں لیکن اگر حضرت کا قول ان کے کان میں پڑ گیا کہ یہ لوگ

(۱) خواہشات نفس میں گرفتار ہو گئے۔

حمال اثقال ہیں(۱) تو ان کو ایک حجت مل جائے گی مگر خاک حجت نہیں کیونکہ اگر کوئی یہ حجت پیش کرے گا تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ابھی ایسے حمال اثقال بہت موجود ہیں جو بلااجرت کے ہمارے اثقال کو اپنے اوپر لادکر پہنچاسکتے ہیں (۲)۔ جب مفت پہنچانے والے نہ رہیں گے اس وقت آپ کو دانت گھسائی بھی دے دیں گے۔ بہرحال حضرت کا یہ مقصود نہ تھا کہ سائلوں کو متصدقین کا شکرگزار ہونے کی ضرورت نہیں اور سائل اپنے کو محسن سمجھیں بلکہ مقصود صرف یہ تھا کہ اغنیا سائلوں کو حقیر نہ سمجھیں اور ان سے تنگ دل نہ ہوں۔ اس لیے یہ راز بیان فرمایا کہ یہ لوگ حمال اثقال ہیں بتلائیے یہ حقیقت کبھی آپ کے ذہن میں بھی آئی ہے اور حضرت کے ہر وقت یہ حقائق پیش نظر تھے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ ان کو ہر وقت آخرت ہی پیش نظر تھی۔

جوتا گھسائی کا لطیفہ

دانت گھسائی پر ایک لطیفہ جوتا گھسائی کا یاد آگیا جو اگرچہ مقام کے مناسب نہیں مگر یاد آگیا اس لیے استطراداً(۳) بیان کئے دیتا ہوں ایک بخیل نمازی بہت تھا اور اکثر بخیل لوگ نمازی بہت ہوتے ہیں۔ شاید اس لیے تاکہ بخل کا عیب کمال عبادت سے مخفی ہوجائے۔ اور لوگ معتقدر ہیں تو اس بخیل کی عادت تھی کہ جب عشاء کی نماز کو جاتا تو چراغ گل کرجاتا ایک دن اتفاق سے چراغ گل کرنا بھول گیا مسجد کے راستہ میں یاد آیا تو الٹا گھر کو واپس آیا اور کواڑوں میں کھٹکا کیا اندر سے باندی آئی اور پوچھا کہ آپ تو بہت جلدی واپس آگئے کیا نماز پڑھ آئے کہا نہیں نماز تو نہیں پڑھی لیکن میں چراغ گل کرنا بھول گیا تھا اس لیے واپس لوٹا باندی

(۱) ہمارا بوجھ اٹھانے والے (۲) ایسے بوجھ اٹھانے والے بہت ہیں جو بغیر اجرت بوجھ اٹھاکر لیجائیں گے
(۳) ضمناً ذکر کردیتا ہوں۔

نے کہا کہ چراغ تو میں نے جبھی گل کر دیا تھا مگر اب مجھے اس کا فکر ہو گیا کہ مسجد سے یہاں تک واپس آنے میں آپ نے جوتے خواہ مخواہ گھسائے۔ بخیل کی باندی اس سے بھی دو قدم آگے تھی تو آپ نے یہ سن کر کہا جزاك اللّٰه وفادار ایسے ہی ہوتے ہیں اور جوتوں کا فکر نہ کریں میں نے اسی خیال سے ان کو بغل میں دبا لیا تھا ننگے پیر آیا ہوں اب وہاں پہنچ کر پہن لوں گا یہ تو بیچ میں ایک لطیفہ تھا۔

حضرت حاجی صاحب کے علوم صحیحہ

اب میں پھر حاجی صاحب کی حالت بیان کرنے کی طرف عود کرتا ہوں(۱) کہ حضرت کے واقعات سے ان کی کامل توجہ الی الآخرۃ کا پتہ چلتا ہے چنانچہ ایک اور حکایت یاد آئی ایک بار ہم لوگ حضرت کی خدمت میں حاضر تھے کہ ایک بوڑھا روتا ہوا آیا اور کہنے لگا حضرت میری بیوی مر رہی ہے دعا کیجئے حضرت نے فرمایا عجیب بات ہے ایک قیدی تو قید سے رہا ہو رہا ہے اور یہ رو رہے ہیں کہ یہ کیوں رہا ہے قید ہی میں کیوں نہ رہا پھر فرمایا میاں روتے کیوں ہو چند روز میں رہا ہو کر تم بھی وہیں پہنچ جاؤ گے جہاں وہ جا رہی ہے۔ میں نے اپنے دل میں کہا واہ آئے تو تھے بیوی کو بچانے یہاں خود ہی سنگوائے گئے کہ اپنے واسطے بھی موت کی بشارت لے چلے۔ مگر حضرت کی گفتگو میں خاص تاثیر تھی کیونکہ دل سے ہر بات نکلتی تھی جس کا اثر یہ ہوا کہ بڑے میاں کا غم کم ہو گیا اور وہ اطمینان کے ساتھ بیٹھ گئے۔ پھر کہنے لگے حضرت مجھ سے ایک شخص نے مدینہ جانے کا وعدہ کیا تھا اب وہ وعدہ سے پھر گیا یہ بات اہل ظاہر کی نظر میں منکر نہ تھی بلکہ ہم تو اس کو اشتیاق مدینہ پر محمول کر کے مستحسن سمجھتے مگر حضرت نے سنتے ہی فرمادیا کہ بس بس ہمارے سامنے شرک

(۱) لوٹتا ہوں۔

کی باتیں نہ کرو غیر اللہ پر اتنی نظر کہ ایک شخص کے وعدہ خلافی کر جانے سے آپ کو اتنا رنج، کیا وہی تم کو مدینہ پہنچائے گا۔ سبحان اللہ کیا علوم صحیحہ تھے حضرت کی یہ حالت تھی کہ یہ باتیں آپ کے دل میں پیوست تھیں جو بے ساختہ زبان سے نکلتی تھیں تصنع کو وہاں ذرا دخل نہ تھا اور تصنع ہمیشہ چل نہیں سکتا ضرور ایک نہ ایک دن قلب کی اصلی حالت ظاہر ہو جاتی ہے اور حضرت کے یہاں عمر بھر ایسے ہی واقعات پیش آتے تھے جن سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ ان کے قلب کو دنیا سے کچھ بھی لگاؤ نہیں ہر وقت توجہ حق تعالیٰ ہی کی طرف ہے پھر ایسا شخص اگر دوستوں کی دلجوئی کو عبادت کہے تو کیا آپ اپنے کو بھی اس پر قیاس کر سکتے ہیں ہرگز نہیں اور اگر قیاس کیا گیا تو اس کی وہی مثال ہوگی جو مولانا نے ایک طوطی کے قصہ میں لکھی ہے۔

سوداگر اور طوطی کی حکایت

ایک سوداگر کی دکان پر ایک طوطی یا مینا تھی جو بہت باتیں کرتی تھی جس سے دکان کی بڑی رونق تھی لوگ طوطی کی باتیں سننے کثرت سے آتے اور سوداگر کا مال بھی خریدتے ایک دن سوداگر کسی کام کو گیا ہوا تھا دکان پر طوطی تنہا تھی کہ دفعۃً بلی آ گئی جس کے خوف سے طوطی اپنی جگہ سے بھاگی اور بوتلوں کے پیچھے جا کر پناہ لی اس کی حرکت سے روغن بادام کی شیشی نیچے گر پڑی اور سارا تیل ضائع ہو گیا سوداگر جو واپس آیا تو طوطی کو جگہ سے بے جگہ دیکھا اور روغن بادام کی شیشی نیچے گری ہوئی پائی اسے غصہ آیا اور غصہ میں طوطی کو اتنا مارا کہ گنجا کر دیا اس پر طوطی اینٹھ گئی اور اس نے بولنا بند کر دیا اس کے بعد سوداگر نے اس کی بہت خوشامد کی مگر اس نے ایک بات بھی نہ کی وہ ہر چند پیار کرتا مگر وہ خاموش ہی رہتی سوداگر کو اس کی خاموشی سے بہت قلق ہوا کیونکہ دکان کی رونق ہی نہ رہی اور اب وہ اپنے آپ کو کوسنے لگا کہ میرے یہ ہاتھ نہ ٹوٹ گئے جن سے میں نے اس کو مارا تھا۔ پھر وہ فقراء وصلحاء کے

پاس دعا کرانے اور وظیفہ پوچھنے بھی گیا مگر کوئی بات کارگر نہ ہوئی اتفاقاً ایک دن سوداگر کی دکان کے سامنے ایک گنجا گزرا جس کے سر پر بال نہ تھے طوطی کو اسے دیکھ کر جوش آیا اور بے ساختہ کہنے لگی۔

ازچہ اے کل باکلاں آمیختی تو مگر از شیشہ روغن ریختی

اے گنجے تو گنجوں میں آکر ملا شاید کہ تونے بھی روغن بادام کا شیشہ توڑ دیا

کہ اے گنجے تو گنجوں میں کیوں داخل ہوگیا شاید تونے بھی روغن بادام گرایا ہے اس بات پر سب بازار والے ہنس پڑے۔

از قیاسش خندہ آمد خلق را گوچہ خود پنداشت صاحب دلق را

مولانا یہ مثال بیان فرما کر ارشاد فرماتے ہیں اور اسی مقصود کے لیے یہ حکایت بیان فرمائی:

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر گرچہ ماند در نوشتن شیر و شیر

گر بصورت آدمی انسان بدے احمد وبوجہل ہم یکساں بدے(۱)

یعنی اپنے افعال کو صورت میں بزرگوں کے افعال سے مشابہ دیکھ کر اپنی حالت کو ان کی حالت پر قیاس نہ کرنے لگو کیونکہ صورت کا اعتبار نہیں بلکہ معنی کا اعتبار ہے۔ پس بزرگوں پر تمہارا اپنے کو قیاس کرنا ایسا ہی ہوگا جیسا طوطی نے اس گنجے کو اپنے اوپر قیاس کیا تھا۔

حجۃ الاسلام حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کا معمول

بعض لوگ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب کی حکایات سے احتجاج کرتے ہیں کہ مولانا کی عادت تھی کہ مہمانوں کی خاطر سے بعض دفعہ نماز اشراق وغیرہ ناغہ کردیتے تھے اس کا بھی یہی جواب ہے کہ مولانا کا اشراق کو حذف کرنا اشراک کی

(۱) ''پاک لوگوں کے کام کو اپنے پر قیاس مت کر اگرچہ لکھنے میں شیر اور شیر برابر ہیں اگر صورت میں آدمی انسان ہوتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوجہل ایک طرح کے ہوتے''۔

وجہ سے نہ تھا بلکہ توحید میں استغراق کی وجہ سے تھا یعنی وہ مخلوق پر نظر نہ کرتے تھے بلکہ عالم ان کے لیے مراۃ جمال حق (۱) تھا ان کے لیے واقعہ دوستوں کے ساتھ باتیں کرنا بھی عبادت میں داخل تھا مگر تم اپنے کو ان پر قیاس نہ کرو مولانا فرماتے ہیں:

لقمہ ونکتہ ست کامل راحلال تو نہ کامل مخور مے باش لال (۲)

تم کامل نہیں ہو اس لیے تم کاملین کے افعال واحوال کی اقتداء نہ کرو اور نہ وہ حلال ہوگا۔

پیش ایں الماس بے اسپر میا کز بریدن تیغ را نبود حیا (۳)

تمہارا تو اس اقتداء سے خاتمہ ہو جائے گا بس تم کو کاملین کے اقوال کی اقتداء کرنا (۴) چاہیے اور تقلید اقوال کا یہ مطلب ہے کہ وہ تم کو جو امر کریں اس پر عمل کرو یہ مطلب نہیں کہ ان کی طرح اسرار وحقائق بیان کرنے لگو کیونکہ اس کا نام تقلید واطاعت نہیں بلکہ اس کو نقالی محض کہتے ہیں اور کاملین کی ایسی نقل جائز نہیں۔ غرض بزرگوں کے یہ قصے اور واقعات ہیں جن سے بعض لوگوں کو شبہ پڑ گیا ہے اور انہوں نے اپنی اغراض کے واسطے ان کو آڑ بنالیا ہے اور تعلق مع الخلق میں اپنے کو اکابر پر قیاس کر کے منہمک ہو گئے اور اس کو مقصود اور محمود دین سمجھنے لگے حالانکہ وہ کامل تھے اور کامل کو بعض اوقات ورد کی ضرورت نہیں رہتی باقی تمہارے لیے تو یہ فتویٰ ہے کہ من لا وردله لا واردله جس کا کوئی ورد معمول بہ نہ ہو اس کو واردات سے حصہ نہیں مل سکتا تم کو ابھی ورد کی ضرورت ہے اگر تم تعلق مع الخلق وارتباط بالاحباب (۵) کی وجہ سے معمولات کو ناغہ کرو گے تو ایک دن بالکل کورے رہ جاؤ گے۔

(۱) ساری دنیا ان کے لیے حق کے جمال کا آئینہ تھی (۲) ''لقمہ اور نکتہ کامل کے لیے حلال ہے۔ تو کامل نہیں ہے مت کھا اور زبان بند رکھ'' (۳) ''اس ہیرے کے پاس بغیر ڈھال کے مت آنا۔ کہ تلوار کو کاٹنے سے شرم نہیں آتی'' (۴) کاملین کی باتوں کو ماننا چاہیئے (۵) لوگوں سے تعلقات کی وجہ سے اور ان کے میل جول کی بنا پر اپنے معمولات وظائف وغیرہ کو ترک کرو گے تو نقصان اٹھاؤ گے۔

کاملین کا حال

کاملین کی تو یہ حالت ہے:

دست بوسی چوں رسید از دست شاہ پائے بوسی اندراں دم شد گناہ(۱)

اور جس کو پائے بوسی بھی نصیب نہ ہوئی ہو اسے دست بوسی کا دعوی کرنا گناہ ہے۔ پس کاملین کو ورد کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کو ہر چیز میں وہی نظر آتا ہے جو ورد میں نظر آتا ہے اسی لیے کامل کو سکوت کی بھی اجازت نہیں بلکہ اسے بولنا چاہیے اور ناقص کو بولنے کی اجازت نہیں اسے ساکت رہنا چاہیے کیونکہ اس کو سکوت ہی میں محبوب کی طرف توجہ زیادہ ہوگی اور کامل کی نطق وسکوت (۲) دونوں میں محبوب کی طرف توجہ رہتی ہے اب اس کو بولنے کی ضرورت ہے تاکہ طالبین کو فیض زیادہ ہو۔

شیخ زبان ہوتا ہے اور مرید کان

چنانچہ حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک بزرگ کو دیکھا کہ وہ ہر وقت ساکت رہتے ہیں (۳) اور ان کے مرید اس بات کو ترستے ہیں کہ شیخ کچھ بولیں تو ہم کو افادہ ہو حضرت نے ان سے فرمایا کہ تم بولتے کیوں نہیں ہو انہوں نے سکوت کے فضائل بیان کئے۔ حضرت نے فرمایا کہ سکوت کے یہ فضائل مبتدی کے لیے ہیں منتہی کے لیے نہیں ہیں بلکہ شیخ کو تو زبان ہونا چاہیے اور مرید کو کان ہونا چاہیے میں نے منتہی کے لیے اس مشورہ کا ایک شعر تجویز کیا ہے۔

بنمائے رخ کہ خلقے والہ شوند و حیراں بکشائے لب کہ فریاد از مردوزن برآید(۴)

ہمارے حضرت کا امام فن ہونا مشائخ عصر کو مسلم تھا(۵)۔ اس لیے

(۱) ''جس کو بادشاہ کا ہاتھ چومنے کو مل گیا ہو اس کے لیے پائے بوسی گناہ ہے'' (۲) بولنے اور چپ رہنے دونوں میں (۳) خاموش (۴) ''اپنا چہرہ دکھلائیے تاکہ مخلوق حیران و پریشان ہو۔ اپنے ہونٹوں کو کھولئے تاکہ مرد اور عورتیں فریاد کریں'' (۵) اس زمانے کے مشائخ کے نزدیک حاجی صاحب کا صاحب فن ہونا تسلیم شدہ تھا۔

حضرت کے ارشاد سے ان بزرگ کی گلجھڑی کھل گئی اور انہوں نے اپنی غلطی کو تسلیم کیا اور مہر سکوت توڑ دی اور بولنا شروع کیا۔ان کے مرید ہمارے حضرت کو دعا دینے لگے کہ خدا آپ کا بھلا کرے آپ نے ہم کو زندہ کر دیا اب بتلائیے کہ ناقص کو کب حق ہے کہ وہ اپنے کو کامل پر قیاس کرنے لگے۔ دوسرے ان حضرات کی حالت یہ ہے کہ علاوہ احکام مشترکہ کے وہ ہر وقت کے احکام خاصہ کو بھی جانتے ہیں اور تکلم وسکوت ہر حالت میں محبوب کے شیون (۱) کو پہچانتے ہیں کہ اس وقت وہ کس چیز سے خوش ہیں وہ بلاشبہ ایسے ہیں جیسے ایاز تھا کہ ایاز کے لیے کوئی قاعدہ اور قانون نہ تھا وہ بادشاہ سے ایسے وقت میں بھی باتیں کرسکتا تھا جس میں دوسروں کے لیے بات کرنے کی اجازت نہ تھی کیونکہ وہ مزاج شناس تھا موقع اور وقت کو پہچانتا تھا۔ اب اگر ہر شخص ایاز کی ریس کرنے لگے تو یہ اس کی حماقت ہی ہے بلکہ اور درباریوں کو تو قواعد وقوانین عامہ ہی کا اتباع لازم ہے اسی طرح تم چونکہ مزاج شناس نہیں ہو تم کو قانون عام ہی پر رہنا چاہئے تم بزرگوں کے افعال کی ریس نہ کرو (۲) اور گو یہ احکام خاصہ بھی عام ہی ہیں یعنی جس شخص کی بھی ایسی خاص حالت ہو ان سب کے لیے عام ہے مگر چونکہ ایسے خواص ہی کم ہیں اس بناء پر ان کو احکام خاصہ کہہ دیا گیا ہے پس اس سے کوئی شخص اس جہل میں نہ پھنس جائے کہ طریقت کے احکام شریعت کے احکام کے مضاد ہیں (۳) نعوذ باللہ بہر حال اس سے مجھے انکار نہیں کہ تعلق مع الخلق بھی ایک درجہ میں محمود ہے مگر اس کی ایک حد ہے۔

کتب تصوف کس کے لیے کارآمد ہیں

اور اس کے لیے خاص خاص مواقع ہیں جن کو کسی کامل سے دریافت کرو۔ محض کتابوں سے یہ مسئلہ حل نہ ہوگا کیونکہ کتابوں میں امور محمودہ کی حدود وغیرہ

(۱) محبوب کے احوال (۲) حرص نہ کرو (۳) احکام طریقت احکام شریعت کے خلاف ہیں۔

کا ایسا ذکر نہیں جس کو عام بھی صحیح طور پر سمجھ لیں اس تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں کتابوں کو بیکار نہیں کہتا وہ بے شک کام کی ہیں مگر طبیب کے کام کی ہیں۔ مریض کے کام کی نہیں۔ کتب طب سے کوئی مریض اپنا معالجہ نہیں کر سکتا حالانکہ کتابوں میں سب کچھ موجود ہے۔ اور طبیب انہی سے علاج کرتا ہے مگر تم نہیں کر سکتے اور اگر معمولی مرض کا علاج کر بھی لیا تو شدید امراض کا علاج تو کبھی نہیں کر سکتے چنانچہ بحران کی بحث گو طب کی کتابوں میں مذکور ہے مگر اس کو ہر شخص نہیں سمجھ سکتا یہ بحث اس قدر لطیف و دقیق ہے کہ اطبائے حال نے یعنی ڈاکٹروں نے تو گھبرا کر اس کا انکار ہی کر دیا کہ بحران کوئی چیز نہیں مگر اطبائے قدماء نے اس بحث کو بڑی خوبی سے ضبط کیا ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کو اس بحث کا الہام ہوا ہے چنانچہ انہوں نے بخار کے ایام کی تقسیم کی ہے کہ بعض ایام میں طبیعت و مرض کا مقابلہ ہوتا ہے۔ طبیعت ان ایام میں مرض کو دفع کرنا چاہتی ہے اور مرض طبیعت کو دبانا چاہتا ہے۔ اس کیفیت و مقاومت (۱) کا نام بحران ہے پھر ان ایام میں بعض دن تو سخت بحران کے ہیں اور بعض دن ہلکے بحران کے اسی لیے مریض کو اور اس کے تیمارداروں کو چاہیے کہ جب کسی کو بخار آئے اس کا دن اور وقت یاد رکھیں تا کہ طبیب سے بیان کر سکیں اور طبیب کو ایام بحران (۲) کی رعایت آسان ہو بھلا محض کتاب دیکھ کر ان امور کی رعایت مریض سے کیونکر ہو سکتی ہے ہرگز نہیں ہو سکتی بلکہ میں تو تجربہ سے کہتا ہوں کہ مریض اپنے معالجہ میں معمولی امراض کے اندر بھی غلطی کھائے گا چنانچہ مجھے پہلے ہر سال برسات کے اخیر میں بخار آیا کرتا تھا (اب تو بحمد للہ بہت سالوں سے نہیں آیا) اور ہمیشہ صفراوی بخار ہوتا تھا میں نے ایک دفعہ خیال کیا کہ مجھے غلبہ صفرا سے بخار ہوتا ہے اور حکیم صاحب ہر سال قریب قریب ایک ہی نسخہ لکھتے ہیں

(۱) اس کیفیت اور جھگڑے کا نام (۲) جن دنوں میں بخار تیز ہو۔

لاؤ اس کو نقل کرلیں جب بخار آیا کرے گا اس کو استعمال کرلیا کریں گے۔ حکیم صاحب کو تکلیف دینے کی ضرورت نہ ہوگی۔ چنانچہ ایک سال ایسا ہی کیا کہ پچھلے سال کا لکھا ہوا نسخہ خود ہی استعمال کرلیا مگر چند روز تک استعمال کرنے سے بھی خاک نفع نہ ہوا آخر کار حکیم صاحب کو بلایا انہوں نے نسخہ لکھا اس کے پینے سے آرام ہوگیا۔ پھر تحقیق ہوا کہ اس سال صفرا کے ساتھ بلغم صاحب بھی تشریف لے آئے ہیں کیونکہ اب بڑھاپے کا سن شروع ہوگیا ہے اب اگر میں اس نسخہ کی بھی نقل کرلیتا کہ چلو اس میں صفرا اور بلغم دونوں کی رعایت ہے تو یقیناً اس سے بھی اگلے سال نفع نہ ہوتا بلغم ہی بڑھتا (یعنی بلکہ تکلیف وغم ہی زیادہ ہوتا یہ بلغم مرکب ہے مفرد نہیں (۱)) کیونکہ مجھے اس کا اندازہ کیسے ہوتا کہ اس سال بلغم صفرا سے زیادہ ہے یا مساوی ہے یا کم ہے۔ اس کا اندازہ تو طبیب ہی کرسکتا ہے جو نبض کی حالت کو پہچانتا ہے۔ اس لیے کتب طب سے معالجہ کرنا طبیب ہی کا کام ہے اسی طرح احیاء العلوم اور فتوحات مکیہ جو تصوف کی کتابیں ہیں بیکار نہیں بلکہ کارآمد ہیں مگر شیخ کے کام کی ہیں طالب کے کام کی نہیں طالب کو تو اپنے معالجہ کے لیے کسی محقق کا اتباع لازم ہے پس تم بزرگوں کے واقعات سن کر تعلق مع الخلق کو اپنے لئے محمود نہ سمجھو بلکہ کسی محقق سے دریافت کرکے اس کے احکام کا اتباع کرو۔

عبادت کا معمول کتنا ہونا چاہیے

یہ غلطی تھی جس میں آج کل بہت سے اہل علم بھی مبتلا ہیں۔ اس وقت میں اس کو رفع کرنا چاہتا ہوں اب آیت کا ترجمہ سنئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ﴾ جب آپ فارغ ہوجائیں کس چیز سے؟ اس پر سب مفسرین کا

(۱) یہ بلغم دو الگ لفظوں سے مرکب ہے بل اور غم پہلے کا مطلب مروڑ اور تکلیف ہے دوسرے کا مطلب غم و پریشانی ہے اس لیے کہا کہ پریشانی اور غم ہی بڑھتا۔

اتفاق ہے ای عن التبلیغ کہ تبلیغ سے فارغ ہونا مراد ہے آگے جزا ہے۔ فانصب یعنی تبلیغ سے فارغ ہوکر محنت کیجئے اور مشقت برداشت کیجئے اس پر بھی اتفاق ہے کہ عبادت میں محنت ومشقت مراد ہے یہاں حق تعالیٰ نے ''فاعبد'' نہیں فرمایا بلکہ ''فانصب'' فرمایا ہے اس سے معلوم ہوا کہ عبادت اتنی کرنا چاہیے جس میں کچھ مشقت بھی ہو گو زیادہ نہ ہو جو تحمل سے زیادہ ہو لیکن اتنی ہونی چاہیے جس میں نفس کو کچھ تکلیف ہو یہ مطلب نہیں کہ اتنی زیادہ محنت کرو جس سے دل اکتا جائے بلکہ اپنی قوت وطاقت کے اعتبار سے اتنی عبادت کی جائے جو تحمل کے موافق ہو اور کسی قدر نفس پر اس میں محنت پڑے۔ بعض لوگ اس مشقت میں بھی پہلے بزرگوں کی نقل کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بھی غلطی ہے کیونکہ پہلے بزرگوں میں قوت زیادہ تھی آج کل اتنی قوت کہاں بس اس کے لیے بھی طالب کو کسی محقق حال کا اتباع کرنا چاہیے۔ اس کے سامنے اپنی حالت بیان کردے پھر جو کچھ وہ تجویز کردے اس کے موافق عبادت کرے محض کتابیں دیکھ کر معمولات مقرر نہ کرے کیونکہ آج کل پہلے بزرگوں کی طرح عبادت کرنا دشوار ہے چنانچہ ایک بزرگ کی عادت تھی کہ وہ رات کو پلاؤ کا قاب سامنے رکھ لیتے اور نفس سے کہتے کہ دو رکعت پڑھ لے۔ پھر تجھے یہ قاب دے دوں گا۔ دو رکعت کے بعد اور پڑھ لے پھر کھلاؤں گا۔ اسی طرح صبح کردیتے مگر یہ انہیں کا نفس تھا جو اس سے بہل جاتا تھا ہماری حالت تو یہ ہے کہ غالباً چار ہی رکعت کے بعد نفس کہہ دے گا کہ تمہارے وعدہ کا تجربہ ہوگیا تم اپنی پلاؤ کو رکھو مجھے اس کی ضرورت نہیں میں ٹھنڈا پلاؤ کھا کر کیا کروں گا بس میں تو اب پڑ کر سوتا ہوں چنانچہ بعضے بچوں کی یہ حالت دیکھی گئی ہے کہ اگر ان سے دس دفعہ سبق کے کہنے کو کہا جائے تو دس دفعہ تو کہہ لیتے ہیں اور اگر کبھی دس کے اوپر دو دفعہ کہنے کو کہا جائے تو وہ دس بار کا پڑھا ہوا بھی بھلا دیتے ہیں۔

چلہ سکوت

ہمارے ایک دوست ہیں وہ باتیں بہت کرتے تھے میں نے ان کو زیادہ باتیں کرنے سے منع کیا مگر یہ تو دشوار معلوم ہوا کہ باتیں کریں اور کم کریں کیونکہ قلت کلام کی ابھی تک عادت نہیں تھی اس لیے یہ تجویز کیا گیا کہ وہ ایک چلہ سکوت (۱) کا کریں جس میں کسی سے بالکل بات نہ کریں اس طرح قلت کلام کی عادت ہوجائے گی تو پھر باتیں کرنے کی حالت میں بھی تقلیل آسان ہوگی مگر احتمال یہ بھی تھا کہ شاید چلہ سکوت نافع نہ ہو اور وہ اس سے تقلیل کلام کے عادی نہ ہوں بلکہ چلہ کے بعد شاید پہلے سے بھی زیادہ بولنے لگیں لیکن اور کوئی طریق سمجھ میں نہ آیا اور چلہ سکوت ہی کو نافع سمجھا گیا میں نے زیادہ کاوش نہ کی کیونکہ احتمال یہ بھی تو تھا کہ چلہ نافع ہوجائے چنانچہ انہوں نے چلہ کیا اور سکوت مطلق اختیار کیا حتی کہ وہ مجھ سے بھی بات نہ کرتے تھے۔ لیکن میں ان سے باتیں کرتا تھا۔ کیونکہ میں تو چلہ میں نہ تھا۔ میں کبھی کبھی ہنس کر کہہ دیتا تھا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ چلہ کے بعد آپ کی وہی مثال نہ ہو جیسے ایک سوار کے گھوڑے کو لید سونگھنے کا مرض تھا کہ چلتے میں جب لید کرتا گھوم کر اسے ایک دفعہ سونگھ لیتا پھر آگے چلتا اسی طرح سارے راستہ میں جب لید کرتا اسے سونگھ کر آگے چلتا تھا ایک دفعہ یہ سوار جارہا تھا کہ راستہ میں ایک اور سوار اس کے ساتھ ہوگیا اس نے جو گھوڑے کو لید سونگھتا دیکھا تو اس سے کہا کہ میاں یہ کیا واہیات ہے اس نے کہا کہ بھائی اس گھوڑے کو یہی مرض ہے اور میں اس سے تنگ آگیا ہوں دوسرے سوار نے کہا بہت اچھا آج میں اس کا یہ عیب نکالوں گا چنانچہ وہ پیچھے ہوگیا اور جب گھوڑے نے لید سونگھنے کا قصد کیا اس نے پیچھے سے دوچار چابک رسید کئے اور وہ سیدھا چلنے لگا۔ پھر جب دوسری دفعہ لید کی اس نے دوچار ہنٹر اور لگائے

(۱) چالیس دن بالکل خاموشی اختیار کریں۔

اور وہ درست ہوگیا غرض پندرہ کوس تک اس نے لید سونگھنے کا اسے موقع نہ دیا اس کے بعد اس کا گاؤں قریب آ گیا اور اس نے کہا لو بھائی ہم تو جاتے ہیں اللہ حافظ پہلے سوار نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ تم نے آج بہت اچھی طرح منزل کٹوادی ورنہ یہ گھوڑا مجھے بہت تنگ کرتا خیر دوسرا تو شکریہ لے کر چلا گیا اور اب اس گھوڑے نے اس کو کن انکھیوں سے دیکھنا شروع کیا جب دیکھا وہ بہت دور ہوگیا اور اپنے گاؤں میں گھس گیا ہے تو یہ گھوم کر الٹا واپس ہوا اور راستہ میں جہاں جہاں لید کی تھی سب کو سونگھا۔ سوار نے ہر چند مارا پیٹا مگر وہ باز نہ آیا اب اس نے دوسرے سوار کو کوسنا شروع کیا کمبخت اگر تو ہنٹر مار مار کر اسے لید سونگھنے سے نہ روکتا تو آج یہ رجعت قہقری(۱) تو نہ ہوتیکہ پندرہ کوس طے کئے کرائے برباد ہوئے اسی طرح مجھے یہ اندیشہ ہے کہ آپ چلہ سکوت کے بعد اس کی کسر پوری نہ کریں اور اتنا بولیں کہ پہلے سے بھی بڑھ جائے چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ چلہ پورا کر کے وہ پہلے سے بھی زیادہ بولے پھر یہاں سے اپنی ملازمت پر چلے گئے وہاں جا کر شعروشاعری میں مشغول ہوگئے اور مشاعروں میں شریک ہونے لگے ذکر وشغل سب چھوٹ گیا پھر اسی زمانہ میں اتفاق سے میرا سفر ان کے مقام ملازمت کی طرف ہوا تو میں نے ان کو دھمکایا اور شعروشاعری سے روک دیا اب حالت اعتدال کی ہے۔

عبادت میں ضرورت اعتدال

اس لیے میں کہتا ہوں کہ اتنی مشقت برداشت نہ کرو جس سے نفس گھبرا جائے ورنہ اس کا انجام تعطل ہوگا کہ جتنا کام کر سکتے تھے وہ بھی نہ کرو گے مگر یہ بھی نہ ہوا کہ بالکل خراب نواب ہی ہو جاؤ کہ اتنی کم عبادت کرو جس میں نفس کو ذرا بھی مشقت نہ ہو بلکہ اعتدال کی رعایت چاہیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین میں

(۱) یہ بالجبر واپسی تو نہ ہوگی۔

اسی کی بہت رعایت فرمائی ہے۔ چنانچہ امامت میں آپ نماز کو مختصر فرماتے تھے اور اسی کا حکم بھی فرمایا ہے۔ من ام منکم فلیخفف فان وراء ہ الضعیف والمریض وذوا الحاجة ومن صلی لنفسه فلیطول ماشاء [1] کہ جو امامت کرے وہ ہلکی نماز پڑھے کیونکہ اس کے پیچھے کمزور، بیمار اور ضرورت مند لوگ بھی ہوتے ہیں جو اپنے لیے نماز پڑھے یعنی منفرد ہو وہ جتنی چاہے تطویل کرے گویا نہ اختصار دائما مطلوب ہے نہ تطویل بلکہ ہر اک کا ایک موقع ہے مگر آج کل اس حدیث کے برعکس حالت ہے کہ جماعت میں تو لمبی لمبی سورتیں پڑھتے ہیں اور تنہا نماز میں اِنَّآ اَعْطَیْنٰکَ اور قُلْ ھُوَ اللّٰہُ ہی ہمیشہ پڑھتے ہیں۔ سورہ بقرہ پوری تو شاید ہی کبھی کوئی پڑھتا ہوگا ہاں صلوٰۃ الکسوف میں کسی متبع سنت نے کبھی پڑھ لی ہو وہ بھی جماعت ہی میں پڑھی ہوگی تنہا کون پڑھتا ہے پس یہ صورت اعتدال کے خلاف ہے بلکہ چاہیے کہ امامت میں تو مقتدیوں کے لحاظ سے اختصار کریں اور تنہا ذرا کسی قدر تطویل کیا کریں ہاں اتنی تطویل نہ کریں جو نفس پر زیادہ شاق ہو جس کو نباہ نہ سکیں غرض نہ تو انقد ہو نہ انحد [2] ہو شاید آپ نے انقد کے معنی نہ سمجھے ہوں گے یہ اختصار ہے الحمد للہ قل ھواللہ کا جس میں الحمد کا الف لیا گیا اور الضالین کا نون اور قل ہواللہ کا قاف اور احد کی دال یہ انقد ہو گیا اور انحد میں ان نفی کا کلمہ ہے یعنی بیحد وہ یہ ہے کہ اتنی تطویل ہو جو حد سے گزر جائے کیونکہ ایک مفرط ہے ایک مفرد ہے اور افراط وتفریط دونوں معیوب ہیں۔

افراط وتفریط پر ایک لطیفہ

افراد وتفریط پر ایک لطیفہ یاد آیا کہ دو شخصوں کے دو شعر ہیں ایک زاہد مفرط کا دوسرا مسرف مفرط کا زاہد نے کہا۔

(۱) الصحیح لمسلم، الصلاۃ ۱۸۶، مسند احمد ۴:۲۱۶ (۲) نہ بہت مختصر نہ بہت طویل۔

گرچہ خدا گفت کلوا واشربوا لیک نفر مود کلوا تا گلوا(۱)

دوسرے نے جواب دیا:

گرچہ خدا گفت ولا تسرفوا لیک نفر مود بکلہیا وضوء(۲)

مضمون دونوں کا صحیح ہے مگر ضرورت اس کی ہے کہ دونوں شعروں کو جمع کیا جائے۔ ورنہ الگ الگ ہر اک کا مضمون ناتمام ہے کہ ایک میں تفریط ہے ایک میں افراط ہے اور ضرورت اعتدال کی ہے جو دونوں کے جمع کرنے سے حاصل ہوگا پس فانصب میں اسی مشقت ومحنت کا امر ہے جو اعتدال کے اندر ہو افراط وتفریط سے پاک ہو اور اعتدال وہ شخص کرسکتا ہے جس کا فہم بھی درست ہو اور تدین میں بھی راسخ کسی کو یہ دولت خود حاصل ہو تو اسے یہ حالت مبارک ہو اور اگر خود حاصل نہ ہو تو اسے کسی کامل کے پاس رہنا چاہیے اور اس طرح رہنا چاہیے۔

قال را بگذار ومرد حال شو پیش مرد کاملے پامال شو(۳)

یعنی اس کے سامنے اپنے کو پامال کردے۔ پامال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی رائے وفکر کو فنا کردے۔

اور اس کے لیے تیار رہے کہ شیخ میری ذات میں جو کچھ بھی تصرف کرے گا میں اس کو خوشی سے برداشت کروں گا اور اس کو اپنی اصلاح وفلاح سمجھوں گا۔ ورنہ اگر بات بات پر اس کو رنج وملال ہونے لگا تو اس کی وہ مثال ہوگی جو مولانا نے مثنوی میں بیان فرمائی ہے کہ ایک شخص قزوینی اور مصور کے پاس جا کر کہنے لگا کہ میری پشت پر شیر کی تصویر بنادو اس نے کہا بہت اچھا اور اس کے بعد نیل اور

(۱) ''اگرچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ کھاؤ اور پیو۔ مگر یہ نہیں فرمایا کہ حلق تک کھاؤ'' (۲) ''اگرچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فضول خرچی نہ کرو۔ لیکن کلہیا سے (چھوٹے سے لوٹے سے وضوء کرنے کا حکم نہیں) وضو کرنے کو نہیں فرمایا'' (۳) ''باتیں بنانا چھوڑو اپنے کو صاحب حال بناؤ کسی مرد کامل کے سامنے خود کو مٹاؤ''۔

سوئی لے کر تیار ہوا اور کمر میں ایک جگہ سوئی کو کچ سے چبھایا اس شخص نے آہ کی اور کہا میاں کیا بناتے ہو کہ دم بنا رہا ہوں کہنے لگا اس کو چھوڑ دو یہ شیر دم کٹا ہی سہی آخر بے دم کے بھی تو شیر ہوتے ہیں۔ مصور نے دم کو چھوڑ کر دوسری جگہ سوئی چبھائی اس نے پھر آہ کی اور کہا اب کیا بنا رہے ہو کہا سر بنا رہا ہوں اس نے کہا سر کو بھی چھوڑ کچھ اور بناؤ اس نے تیسری جگہ سوئی چبھائی اس نے پھر آہ کی اور پوچھا کیا بنا رہے ہو کہا کان بنا رہا ہوں کہا کان کو بھی رہنے دو کیا شیر بوجا (۱) نہیں ہوتا اس نے چوتھی جگہ سوئی چبھائی اس نے پھر آہ کی اور کہا اب کیا بناتے ہو کہا پیٹ بنا رہا ہوں کہنے لگے اس کو کچھ کھانا پینا تھوڑا ہی رہ گیا ہے پیٹ بھی رہنے دو مصور نے سوئی پھینک دی اور کہا:

شیر بے گوش وسر وشکم کہ دید　　این چنیں شیرے خدا ہم نافرید (۲)

کہ ایسا شیر خدا نے بھی پیدا نہیں کیا جس کے نہ سر ہو نہ پیٹ ہو پھر میں بدوں اس کے شیر کی تصویر کیونکر بنادوں جاؤ معلوم ہوتا ہے کہ تم کو شیر مطلوب ہی نہیں اس پر مولانا فرماتے ہیں اور اس مضمون کے لیے حکایت لائے ہیں۔

چوں نداری طاقت سوزن زدن　　پس تو از شیر ژیاں کم دن بزن (۳)

کہ جب تمہیں ایک سوئی چبھانے کی بھی تاب نہیں تو شیر کی تصویر بنوانے کا دعویٰ بھی نہ کرو یا مطلب عالی کا نام نہ ہو اور کمال حاصل کرنے کی طلب ہی نہ کرو کیونکہ کمال تو اس طرح ہی حاصل ہوگا کہ کاملین کے سامنے اپنے کو پامال کردو عارف اسی کو فرماتے ہیں۔

یا مکن باپیلباناں دوستی　　یا بناکن خانہ بر انداز پیل
یا مکش برچہرہ نیل عاشقی　　یا فروشو جامہ تقویٰ بہ نیل (۴)

(۱) کان کٹا (۲) ''ایسا شیر کہ جس کے کان بھی نہ ہوں پیٹ بھی نہ ہو کسی نے نہیں دیکھا ایسا شیر خدا تعالیٰ نے بھی پیدا نہیں کیا'' (۳) ''جب تو سوئی کی بھی برداشت نہیں کرسکتا تو پھر شیر مست کا نام مت لے'' (۴) ''یا تو ہاتھی والوں سے دوستی مت کرو اگر کرتے ہو تو ہاتھی کے قد کے برابر مکان بناؤ۔ اپنے چہرہ پر عاشق کا نشان مت لگا، یا پرہیزگار کے کپڑے دریائے نیل میں دھو''۔

یعنی جامہ دعویٰ تقویٰ اگر عاشقی کی صورت اختیار کرتے ہو تو دعویٰ تقویٰ کے لباس کو دھوڈالو یعنی اپنے کو متقی اور بزرگ نہ سمجھو بلکہ ذلیل وخوار وگنہگار سمجھو۔ اور شیخ اگر تم کو نالائق و پاجی کا خطاب دے تو اس سے ذرا بھی ملول نہ ہو اور اگر ملال پیدا ہوا تو تم مولانا کے اس قول کے مصداق ہو۔

تو بیک زخمے گریزانی زعشق تو بجز نامے چہ می دانی زعشق(۱)

بس آج کل تو ایسے طالب رہ گئے ہیں کہ خود مجھ سے ایک تعلق دار اودھ نے یہ کہا کہ کسی ایسے پیر کا پتہ بتلاؤ جو مریدوں کی خاطر کرتا ہو مولانا شاہ فضل الرحمٰن صاحب کے یہاں تو مریدوں کی بڑی ذلت ہوتی ہے۔ افسوس یہ لوگ طالب خدا ہو کر اس کے طالب ہیں کہ شیخ ان کی خاطر وعزت کرے اور ہم نے ادنیٰ ادنیٰ فنون کے طالبوں کو دیکھا ہے کہ وہ استاد کے تھپڑ اور طمانچے کھاتے ہیں اور ذرا ملول(۲) نہیں ہوتے۔ مولانا رحمت اللہ صاحب مہاجر مکی سے بواسطہ ایک ترکی سپاہی کی حکایت سنی گئی ہے۔ کہ ایک دن پریڈ کر رہا تھا کہ اس میں اس سے کچھ غلطی ہوئی تو افسر نے اس کو ایک تھپڑ مارا اور سپاہی بدستور اپنے کام میں لگا رہا اور افسر کے تھپڑ سے اس پر کسی قسم کی ناگواری ظاہر نہ ہوئی۔ مولانا فرماتے ہیں کہ مجھے بڑی حیرت ہوئی کیونکہ یہ سپاہی حکومت کا نوکر بھی نہ تھا بلکہ اپنے گھر کا رئیس تھا اور قواعد سپہ گری محض اس لیے سیکھتا تھا کہ ترکی حکومت نے قانوناً سب کے ذمہ فوجی قواعد کا سیکھنا لازم کر رکھا تھا۔ مولانا فرماتے ہیں کہ میں نے دوسرے وقت اس ترکی سے پوچھا کہ تم کو افسر کے تھپڑ سے کچھ رنج ہوا تھا یا نہیں تو وہ ہنسنے لگا اور کہا اگر آج ہم اس پر رنج کریں گے تو پھر کل کو جنرل بننے کے قابل کیوں کر ہوں گے۔ واقعی سچ کہا حقیقت میں جو بچہ یا سپاہی اپنے استاد اور افسر کے تھپڑ سے بھاگے گا وہ محروم رہے گا۔

(۱) ''تو ایک زخم کی وجہ سے عشق سے بھاگتا ہے تو اس عشق کا نام ہی نام جانتا ہے'' (۲) رنجیدہ۔

ہر آن طفل کو جور آموزگار نہ بیند جفا بیند از روزگار(۱)

ایک سب جج کی حکایت

میرے ایک دوست نے ایسی ہی ایک حکایت ایک سب جج کی بیان کی مگر سب جج ایسے نہیں ہوتے کہ انہوں نے جائے ملازمت پر ایک باہر والی عورت کو اپنے گھر میں ڈال لیا تھا اور اسکی محبت میں ایسے مشغول ہوئے کہ گھر پر اپنی بیوی بچوں کو بھی خرچ بھیجنا بند کر دیا ان کے والد صاحب کو کسی سے یہ خبر معلوم ہوگئی کہ صاحبزادہ نے کسی باہر والی عورت کو اپنے پاس رکھا ہے وہ سنتے ہی برافروختہ ہوگئے اور گھر سے چل کھڑے ہوئے یہاں تک کہ اس شہر میں پہنچے جہاں سب جج صاحب ملازم تھے لوگوں سے پتہ پوچھا معلوم ہوا کہ کچہری میں اجلاس کر رہے ہیں وہ غصہ میں بھرے ہوئے اجلاس ہی پر پہنچے سب جج نے جو اپنے والد کو دیکھا تعظیم کے لیے اٹھنا چاہا مگر بڈھے نے اتنی مہلت ہی نہ دی اور کرسی پر گرا کر ان کو جوتا سے مارنا شروع کیا لوگوں نے دوڑ کر ان کو روکنا چاہا سب جج نے سب کو دھمکا دیا کہ خبر دار کوئی آگے نہ بڑھے یہ میرے قبلہ وکعبہ ہیں غرض بڈھے نے خوب دل بھر کر مارا جب تھک گئے تو ایک طرف کو بیٹھ گئے سب جج نے کپڑے جھاڑ کر عرض کیا کہ اگر اجازت ہو تو میں کچھ کام کرلوں اور اگر دل میں کچھ اور غبار باقی ہو تو میں حاضر ہوں۔ بڑے میاں نے پھر کندہ کاری شروع کی اس کے بعد کہا اچھا اب اجلاس کا کام کرو۔ سب جج نے پھر بدستور مقدمات کی سماعت میں مشغول ہوگئے اس وقت تو بظاہر ان کی ذلت ہوئی مگر شہر میں جب یہ خبر مشہور ہوئی تو ہر شخص کی زبان پر ان کی تعریف تھی کہ سبحان اللہ کیسے لائق فرزند اور سعادت مند بیٹے ہیں کہ باوجود اتنی

(۱) ''جو بچہ کہ اپنے استاد کا ظلم برداشت نہیں کرسکتا وہ دنیا میں تکلیف اٹھائے گا''۔

عزت وعظمت کے بھی باپ کے ہاتھ سے پٹنا ناگوار نہیں ہوا۔ واقعی اپنے بزرگوں کے ہاتھ سے جو ذلت ہو وہ ذلت نہیں۔ بلکہ بڑی عزت ہے۔ اس لیے اپنے بزرگوں کے سامنے ذلت سے ناگواری نہ ہونا چاہیے۔ یہی کامیابی اور عزت کا پیش خیمہ ہے پس فہم کا درست کرنا چاہتے ہو تو کاملین کے سامنے ہر ذلت کو گوارا کر کے کچھ دن رہو ان شاء اللہ فہم درست ہو جائے گا ہاں کوئی خود ہی سلیم الفہم (۱) ہو تو وہ اس سے مستثنیٰ ہے اس کو صحبت کامل کی ضرورت نہیں مگر ایسے نادر ہیں جیسے بعض دفعہ مرغی کے انڈے میں سے محض مشین کی گرمی پہنچانے سے بچہ نکل آتا ہے مگر سنا یہ ہے کہ ایسے بچے زندہ نہیں رہتے جلد ختم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح جو لوگ خود سلیم الفہم ہوتے ہیں ان کو اصلاح خلق کے مناسبت تامہ نہیں ہوتی گو فہم کتنا ہی سلیم ہو مگر ان سے فیض نہیں چلتا فیض رسانی کی شان اسی بچہ میں آئے گی جس نے کچھ دنوں کسی مرغی کے نیچے رہ کر پر و بال نکالے ہوں۔ باقی حضرات انبیاء کو ادبنی ربی فاحسن تادیبی وعلمنی ربی فاحسن تعلیمی (۲) کے سبب تربیت خلق کی حاجت نہیں ہوتی۔ یہ گفتگو فانصب کی تفسیر پر چلی تھی کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ نہ تو حد سے زیادہ مشقت ہو نہ بالکل نوابی ہو بلکہ اعتدال چاہے اور اعتدال کسی محقق سے سیکھو اور آج کل سب مشائخ محقق نہیں ہوتے بلکہ بعضے تو بہت زیادہ کام لیتے ہیں چنانچہ ایک بزرگ کے یہاں ہر شخص کے لیے چوبیس ہزار دفعہ اسم ذات کی تعلیم تھی چاہے وہ مشغول ہو یا بیمار ہو اس سے کم کسی کو نہ بتلاتے سو یہ لوگ محقق نہیں ہیں بلکہ عطائی ہیں عارف ان کی بہت شکایت فرماتے ہیں۔

خستگانرا چوں طلب باشد وقوت نبود گر تو بیداد کنی شرف مروت نبود (۳)

(۱) سمجھدار (۲) ''میرے رب نے مجھے ادب سکھایا پس کتنا اچھا ادب سکھایا اور میرے رب نے مجھے تعلیم دی پس کتنی اچھی تعلیم دی'' کشف الخفا للعجلونی ۸۷، کنز العمال: ۳۱۸۹۵ (۳) ''زخمیوں کو جب طلب ہو اور طاقت نہ ہو اگر تو ظلم کرے مروت نہیں''۔

اور فرماتے ہیں:

طفل را گر نان دہی بر جائے شیر طفل مسکیں رازاں نان مردہ گیر(۱)

چار پارا قدر طاقت بارنہ برضعیفاں قدر ہمت کار نہ(۲)

یاد رکھو مطلوب کا حاصل ہونا کچھ زیادہ کام کرنے پر موقوف نہیں بلکہ بقدر ہمت طلب ہونا چاہیے۔ بزرگوں نے فرمایا ہے کہ مریض ضعیف کی چھ رکعتیں قوی کی چھ سو رکعتوں کی برابر ہے کیونکہ اس کو چھ رکعت ہی کی ہمت ہے اور ثواب دینے والے اللہ تعالیٰ عزشانہ ہیں وہ ہر شخص کی حالت اور ہمت کو اچھی طرح جانتے ہیں اسی لیے ہمارے حاجی صاحب فرماتے ہیں۔

بس ہے اپنا ایک بھی نالہ اگر پہنچے وہاں گرچہ کرتے ہیں بہت سے نالہ وفریاد ہم

واقعی اگر دل سے اور توجہ سے تھوڑا کام بھی ہو تو وہ بے توجہی کے ساتھ زیادہ کام کرنے سے بڑھ کر ہے پس جو زیادہ کام نہ کر سکے وہ تھوڑا ہی کرے مگر توجہ سے کرے اور دل سے کرے یہی وصول کے لیے کافی ہے ایک بزرگ فرماتے ہیں۔

بفراغ دل زمانے نظرے بماہ روے بہ ازاں کہ چتر شاہی ہمہ روز ہائے ہوئے(۳)

فراغ دل کی قید قابل لحاظ ہے واقعی فراغ دل کے ساتھ تھوڑی دیر بھی خدا کو یاد کر لینا بڑی دولت ہے۔ حضرت شیفتہ فرماتے ہیں اور چونکہ وہ نقشبندی ہیں اس لیے وہ اس مضمون کو نقشبندیہ کے رنگ میں بیان فرماتے ہیں۔

چہ خوش ست با تو بزمے بہ نہفتہ ساز کردن درخانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن(۴)

اس حالت کے ساتھ واقعی ایک بزم بھی بہت بڑی دولت ہے۔ پس یہ طریقہ

(۱) ''بچہ کو اگر دودھ کی بجائے روٹی کھلا دے تو وہ بچہ مر جائے گا'' (۲) ''چوپایوں پر طاقت کے مطابق بوجھ رکھو۔ کمزوروں سے محنت کے موافق کام لو'' (۳) ''فارغ البالی کے ساتھ اپنے محبوب کی طرف نظر کرنا بہتر ہے کہ بادشاہی میں تمام دن شور وغل کرنا'' (۴) ''کیا اچھا ہو کہ تو محفل میں اکیلا ہو گھر کا دروازہ بند اور شراب کا شیشہ کھلا ہو''۔

غلط ہے کہ سارے طالبوں کو ایک ہی لکڑی ہانکا جائے۔ بلکہ اقویا(۱) کو ان کے مناسب کام بتلاؤ اور ضعفاء(۲) کو تھوڑا بتلاؤ اور اس کی تاکید کرو کہ وہ تھوڑا ہی کام توجہ کے ساتھ کریں ان شاء اللہ وہ زیادہ ہی کے برابر ہوجائے گا۔

ہر نماز کے بعد تین مرتبہ لا الٰہ الا اللہ کہنے کا حکم

چنانچہ بعض بزرگوں نے اپنے بعض مریدوں کو جو دینی مشاغل میں زیادہ مشغول تھے صرف اتنا کام بتلایا ہے کہ ہر نماز کے بعد تین مرتبہ لا الٰہ الا اللہ جہراً کہہ لیا کرو اب رسمی پیروں کے یہاں یہ رسم ہوگئی کہ نماز کے بعد یا فجر وعصر کے بعد سارے نمازی مل کر جہراً لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں اور اس کا سختی کے ساتھ التزام کرتے ہیں حالانکہ سب کے واسطے بزرگوں نے نہیں کیا تھا بلکہ خاص خاص لوگوں کو بتلایا گیا تھا۔ مگر جاہلوں نے اس کو حکم عام ہی بنالیا اور التزام کرلیا اسی واسطے علماء نے اس کو بدعت کہا اب ان پر آوازیں کسے جاتے ہیں کہ لو بھائی ذکر اللہ بھی بدعت ہوگیا ہائے علماء کی بڑی مصیبت ہے ان سے بھی کوئی جماعت خوش نہیں مگر محقق صوفیہ ان سے خوش ہیں وہ ان کی قدر کرتے ہیں چنانچہ علامہ شعرانی جو بہت بڑے محقق صوفی ہیں فرماتے ہیں کہ نزاع صوفیہ دقیق ہے(۳) جو عوام کی فہم سے بالا ہے اس لیے عوام کو بھی لازم ہے کہ علوم میں صوفیہ کا اتباع نہ کریں بلکہ علماء اور جمہور کا اتباع کریں کیونکہ یہ لوگ منتظم ہیں نظام شریعت بلکہ عالم علماء(۴) ہی کے اتباع سے قائم رہ سکتا ہے ہمارے ماموں صاحب کہتے تھے کہ اگر علماء دنیا میں نہ ہوتے تو سب لوگوں کو کافر ہی بنادیتے کیونکہ ہماری باتیں عوام کی فہم سے خارج ہیں نہ معلوم وہ کیا سے کیا سمجھتے اور ایمان کو برباد کردیتے مولویوں کا بڑا احسان ہے کہ انہوں

(۱) طاقتوروں کو (۲) کمزوروں (۳) صوفیاء کے اختلافات کو سمجھنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں (۴) بلکہ نظام عالم۔

نے مخلوق کا ایمان سنبھال رکھا ہے۔ تو اے وہ صوفی جو مولویوں سے ناخوش ہے اور ان پر آوازیں کستا ہے تو ان کا احسان مان کہ تو انہی کی بدولت چین سے بیٹھا ہوا اللہ اللہ کر رہا ہے اور گوشہ عافیت میں بیٹھا ہوا ہے۔ منتظم پولیس کی قدر جبھی ہوتی ہے جبکہ رات کو راحت سے پڑ کر سوتے ہو پس یہ علماء منتظم پولیس ہیں کہ مخلوق کے ایمان کی حفاظت کرتے ہیں اگر یہ اپنا کام چھوڑ دیں تو پھر صوفی صاحب کو حجرہ سے نکل کر یہ کام کرنا پڑتا اور سارا تصوف اور حال وقال رکھا رہ جاتا۔

اصلاح خلق کا کام فرض کفایہ ہے

کیونکہ اصلاح خلق کا کام فرض کفایہ ہے اگر مولوی اس کو چھوڑ دیں تو پھر صوفیوں پر ملاں بننا فرض ہوجائے گا پس تیری گٹھڑی کی خیر اسی وقت تک ہے جب تک یہ منتظم جماعت دنیا میں موجود ہے تم تو رات کو پڑ کر آرام کرتے ہو اور آنکھ کھل گئی تو نماز وذکر میں مشغول ہوجاتے ہو اور مولویوں کی یہ حالت ہے کہ حضرت شاہ اسماعیل صاحب رات کو سید صاحب کے مہمانوں کے پیر دبایا کرتے تھے اور اگر کوئی پوچھتا کون ہے تو فرمادیتے کہ میں ہوں سید صاحب کا نوکر یہ سن کر مہمان خاموش ہوجاتے بہت عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ مولانا اسماعیل صاحب پیر دبانے آیا کرتے ہیں یہ تو پہلے بزرگوں کا قصہ ہے اور میں نے اپنے استاد مولانا محمود حسن صاحب قدس سرہ کی ایک حکایت اس سے بڑھ کر سنی ہے مجھے تو یہ حکایت سن کر پسینہ آگیا کہ حضرت نے اپنے کو کس درجہ مٹایا تھا وہ یہ کہ حضرت کے یہاں ایک مہمان آئے جن کے ساتھ ایک کافر بھی تھا گرمی کی دوپہر میں جب مہمان سو رہے تو مولانا دبے دبے پاؤں تشریف لائے اور اس ہندو کے پاؤں دبانا شروع کئے راوی کا بیان ہے کہ اس وقت میں اتفاق سے جاگ رہا تھا میں گھبرا کر پہنچا اور

عرض کیا کہ حضرت آپ یہ کیا کر رہے ہیں فرمایا یہ بیچارہ تھکا ماندہ ہے اس کی تھکن اتار رہا ہوں میں نے کہا حضرت پھر میں دبادوں گا آپ ہٹ جائیں فرمایا نہیں تم تو خود تھکے ہوئے ہو اور مہمان بھی، بس تم پڑے رہو غرض نہ معلوم کتنی دیر تک اس کافر کے پیر دبائے اور وہ بے ہوش پڑا سوتا رہا کیونکہ کافروں کی آنکھ تو مرنے ہی پر کھلے گی جب عذاب کے فرشتے نظر آئیں گے تو یہ بیداری میں بھی سوتے ہی رہتے ہیں۔ اور مولانا پر غلبہ حال تھا کہ منتہی ہو کر ایسا کام کیا بھلا آج کل کسی صوفی نے بھی ایسا کیا ہے ہم نے تو کسی کو نہیں سنا پھر وہ کس منہ سے علماء پر آوازیں کستے ہیں لیکن اس جگہ منتہیوں (۱) کے لیے ایک بات کہتا ہوں اور شاید وہ بات آپ مجھ ہی سے سنیں گے کسی اور سے نہ سنیں گے وہ یہ کہ جس جگہ زیادہ تواضع کرنے سے دوسرے کو تکلیف ہوتی ہو وہاں قصداً اتنی تواضع نہ کرو باقی اگر حال ہی غالب ہو جائے یا اس احتمال کی طرف التفات ہی نہ ہو وہ اور بات ہے۔

تواضع میں ضرورت اعتدال

جیسے مولانا محمد حسین صاحب الہ آبادی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ ایک دفعہ میں حرم میں بیٹھا ہوا تھا اور جوتے دروازے پر چھوڑ آیا تھا کہ حاجی صاحب قدس سرہ تشریف لائے اور آپ نے میرے جوتے لاکر چپکے سے میرے پاس رکھ دیئے اور فرمایا کہ وہ جگہ اطمینان کی نہ تھی جوتے اپنے پاس رکھنا چاہیے۔ مولوی صاحب فرماتے تھے کہ میں ندامت میں غرق ہو گیا اور دیر تک پسینہ پر پسینہ آتا رہا کہ اللہ اکبر کہاں حضرت اور کہاں یہ تکلیف میں نے کیسی حماقت کی مگر حضرت کو اس طرف التفات ہی نہیں ہوا کہ یہ کوئی بڑی تواضع کی بات ہے تو بعض طبائع کو بلکہ اکثر کو واقعی اپنے بزرگوں کی زیادہ تواضع کرنے سے بہت ندامت و تکلیف ہوتی ہے اور

(۱) جو لوگ تصوف میں آخری درجہ کی طرف گامزن ہیں۔

بعضے بزرگوں کو اپنے خدام کی خدمت سے بھی تکلیف ہوتی ہے وہ اس کو پسند نہیں کرتے کہ کوئی خادم ان کی جوتیاں اٹھاوے اور رکھے تو وہاں ان کی بھی ایسی خدمت نہ کرے چنانچہ مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی جوتیاں ایک حافظ صاحب نے جو مولانا کے مرید بھی تھے اٹھا کر رکھ دیں تو مولانا کھڑے ہوگئے اور فرمانے لگے کہ حافظ صاحب یہ جوتے تو تبرک اور سر پر رکھنے کے قابل ہوگئے اب بتلاؤ پاؤں میں کیا پہنوں۔ مطلب یہ تھا کہ آئندہ سے ایسا نہ کرنا مجھے تکلیف ہوتی ہے۔ مگر اس مضمون کو لطیف عنوان سے بیان فرمایا اسی طرح ہمارے استاد مولانا فتح محمد صاحب کو لوگوں کی خدمت سے تکلیف ہوتی تھی وہ اس کو پسند نہ کرتے تھے کہ کوئی ان کی جوتیاں اٹھاوے۔ ایک دفعہ مولانا جوتیاں اپنے ہاتھ میں لیے ہوئے جامع مسجد کے فرش پر آرہے تھے کہ ایک معتقد دوڑے اور جوتیاں لینا چاہا مولانا نے نہیں دیں اس شخص نے ایک ہاتھ سے مولانا کی کلائی زور سے پکڑی اور دوسرے ہاتھ سے جھٹکا دے کر جوتے چھیننے کی کوشش کر رہا تھا کہ اتنے میں میں پہنچ گیا اور میں نے اس کو ڈانٹا دھمکایا کہ بزرگوں کے ساتھ یہ گستاخی کہ ان سے چھینا چھپٹی کرتے ہو بس خدمت وہی اچھی جس سے بزرگوں پر گرانی نہ ہو غرض بزرگوں کو بھی اس کا خیال کرنا چاہیے کہ اپنے خدام کے ساتھ ایسی تواضع نہ کریں جس سے ان کو خجلت وکلفت (۱) ہو اور خدام کو بھی اس کا خیال کرنا چاہیے کہ اپنے بزرگوں کو جو خدمت ناگوار ہو وہ نہ کیا کریں۔ بلکہ بزرگوں کے لیے تو اس کی ضرورت ہے کہ کبھی کبھی خادم سے کہہ دیا کریں کہ جوتے وہاں سے اٹھا کر یہاں رکھ دو اس کے یہ معنی نہیں مریدوں کو ذلیل کیا کریں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس سے خادم خوش ہوں گے کہ ہم کو اپنا سمجھتے ہیں اور کبھی یہ خدمت بہ نیت اصلاح وتعلیم تواضع کے لینا چاہیے کیونکہ اصلاح اسی طرح ہوسکتی ہے۔ کہ عملاً اس کا رتبہ بتلادے خود خادم بن کر آپ

(۱) شرمندگی اور پریشانی۔

مخلوق کی اصلاح نہیں کر سکتے۔ بلکہ آج کل طبائع میں ایسی کجی ہے(۱) کہ چند دن کے بعد ایسا کرنے سے عام لوگ بیباک ہوکر سر پر چڑھ جائیں گے اور خود تمہاری ہی اصلاح کرنے لگیں گے جیسے ایک بزرگ سے سانپ بیعت ہوگیا تھا آپ نے اس سے عہد لیا کہ کسی کے کاٹنا نہیں اس نے عہد کرلیا یہ خبر جانوروں کو بھی ہوگئی تو سب نے آکر اسے تنگ کرنا اور نوچنا کھسوٹنا شروع کردیا کیونکہ اس سے تو اطمینان تھا کہ یہ کاٹے گا نہیں چند روز کے بعد ان بزرگ کا جنگل میں سے گزر ہوا تو سانپ کو زخمی برے حال میں دیکھا پوچھا کیا ہوا تو مردہ کیوں ہورہا ہے کہا حضرت میری بیعت وعہد کا حال جانوروں کو معلوم ہوگیا اب سب مجھے مارتے اور تنگ کرتے ہیں اگر میں کچھ کہوں تو بیعت ٹوٹتی ہے۔ فرمایا میں نے کاٹنے سے منع کیا ہے پھنکارنے سے منع نہیں کیا اب کے کوئی تیرے پاس آئے تو پھن اٹھا کر پھنکار دیا کر جس سے دیکھنے والے کو یہ شبہ ہو کہ کاٹنا چاہتا ہے اب غریب کو چین ہوا اور جانور دور بھاگنے لگے اسی طرح بزرگوں کو بھی بعض دفعہ پھنکارنے کی ضرورت ہے تاکہ لوگ سر نہ چڑھ جائیں چنانچہ شاہ فضل الرحمٰن صاحب کا یہی رنگ غالب تھا اور ہمارے مشائخ ہر چند کہ بہت خلیق ہیں اور اپنے پاس آنے والوں کے ساتھ نرمی کرتے ہیں لیکن تعلیم کے وقت ضرورت کے موقعہ پر وہ بھی سیاست سے کام لیتے ہیں چنانچہ حضرت مولانا محمد قاسم صاحب ہمارے حضرات میں سب سے زیادہ نرم اور ایسے خلیق تھے کہ عوام بھی ان کو خلیق مانتے تھے لیکن مولانا کی ایک حکایت امیر شاہ خاں صاحب مرحوم نے بیان فرمائی اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تعلیم کے وقت مولانا بھی سیاست سے کام لیتے تھے۔ امیر شاہ خاں صاحب کا بیان ہے کہ ایک دفعہ مولانا دہلی تشریف لائے اور شاید کسی مطبع میں قیام فرمایا مولانا احمد حسن صاحب امروہی بھی ساتھ تھے رات کو مولانا احمد حسن صاحب کی اور میری چارپائی متصل تھی

(۲۱) ٹیڑھا پن۔

اور مولانا کی چارپائی ذرا فاصلہ پر تھی ہم دونوں باہم باتیں کرنے لگے میں نے کہا صبح کی نماز ایک برج والی مسجد میں پڑھیں تو اچھا ہے کیونکہ سنا ہے وہاں کے امام قرآن اچھا پڑھتے ہیں وہ قاری بھی ہیں اور خوش الحان بھی ہیں اس پر مولانا احمد حسن صاحب نے چونکہ باہم خوب بے تکلفی تھی برہم ہوکر فرمایا کہ ارے پٹھان تو بڑا جاہل ہے کہ ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا چاہتا ہے جو ہمارے حضرت (یعنی مولانا محمد قاسم صاحب) کی تکفیر کرتا اور ان کی شان میں گستاخی کرتا ہے یہ بات مولانا نے بھی سن لی فرمایا ارے احمد حسن مولانا کے تو وہ شاگرد تھے اور محبوب شاگرد تھے ان کو اس طرح خطاب کرنے کا حق تھا مگر ہم کو یہ حق نہیں کیونکہ مولانا احمد حسن صاحب ہمارے تو مخدوم ہیں ہاں نقل کرنے کا مضائقہ نہیں جیسے حق تعالیٰ کو عَصٰی اٰدَمُ رَبَّہٗ فَغَوٰی کہنے کا حق ہے کیونکہ وہ خدا ہیں اور آدم علیہ السلام ان کے بندے ہیں خدا کو حق ہے کہ اپنے بندہ کو جس طرح چاہیں خطاب فرمائیں گو وہ بندہ کیسا ہی عالی رتبہ ہو مگر خدا تعالیٰ کے سامنے تو سب بندے اور غلام ہی ہیں۔ لیکن ہمیں اور آپ کو اپنی طرف سے ایسا کہنے کا حق نہیں ورنہ گردن پنے گی البتہ نقل کا مضائقہ نہیں۔ چنانچہ تلاوت میں بطور نقل کے ہم اس کو پڑھتے ہی ہیں غرض مولانا نے فرمایا ارے احمد حسن میں تو سمجھا تھا کہ تجھے کچھ علم آ گیا تو اوروں کو جاہل کہتا ہے مگر تو خود جاہل ہے ارے کیا وہ امام محض اس وجہ سے کہ میری تکفیر کرتا ہے امامت کے قابل نہیں رہا یہ تو اسکی دینداری کی علامت ہے کیونکہ وہ جو مجھے برا کہتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کو کسی کے ذریعہ سے میرے متعلق کوئی بددینی کی بات پہنچی ہے جو اس کے نزدیک بددینی میں داخل ہے اس حالت میں تو اس پر واجب تھا کہ مجھے برا سمجھے یہ تو اس کی دینداری کی علامت ہے کہ جس شخص کے متعلق اس کو بددینی کی

بات پہنچتی ہے جس کو وہ اپنے زعم میں دین کے خلاف سمجھتا ہے اس کو برا سمجھتا ہے اس کے بعد فرمایا کہ صبح کو ہم اسی امام کے پیچھے نماز پڑھیں گے چنانچہ صبح کو وہیں تشریف لے گئے اور اپنے مخالف کے پیچھے نماز پڑھی اس حکایت سے مولانا کے بہت سے کمالات ظاہر ہوتے ہیں منجملہ ان کے یہ بھی ہے کہ تربیت وتعلیم کے وقت مولانا سیاست وتنبیہ سے کام لیتے اور حاکمانہ لہجہ اختیار فرماتے تھے تواضع محض کی صورت ہر موقع پر اختیار نہ فرماتے تھے اور واقعی بدون اس کے اصلاح دشوار ہے باقی مولانا محمد اسمعیل صاحب اور مولانا دیوبندی رحمہما اللہ تعالیٰ کے جو واقعات میں نے اوپر بیان کئے ہیں وہ غلبہ حال کا اثر تھا اور غلبہ حال ہر وقت نہیں رہا کرتا لیکن میں یہاں سے مبتدیوں کے کان کھولتا ہوں کہ جب ان حضرات نے جو منتہی تھے ایسے ایسے کام کئے ہیں اور مسافروں اور کافروں تک کے پیر دبائے ہیں تو تم کو مبتدی ہوکر ان کاموں سے کیا شے مانع ہے۔

طریق اصلاح کی شرط اول

افسوس آج کل کے مبتدی عوام کے سامنے تو اپنے کو کیا مٹاتے یہ تو اپنے کو شیخ کے سامنے بھی نہیں مٹاتے جس کے سامنے اپنے کو پامال کردینا طریق کی اول شرط ہے مگر یہ اس کے سامنے بھی اپنی فکر ورائے کو فنا نہیں کرتے خودرائی سے کام لیتے ہیں حالانکہ کمال اس وقت تک حاصل نہیں ہوسکتا جب تک اپنے کو کسی کامل کے ہاتھ میں کا لمیت فی یدالغسال (۱) سپرد نہ کردو اور حقائق کا انکشاف بھی اسی پر موقوف ہے۔ چنانچہ اس حقیقت میں جو آج کل خلط ہورہا ہے کہ یہ خبر نہیں تعلق مع الخلق کس درجہ میں مانع ہے اور کس درجہ میں مانع نہیں ہے اس کی تحقیق کے لیے بھی صحبت کاملین کی اسی طرح ضرورت ہے کہ اپنے کو بالکل ان کے سپرد

(۱) جیسے مردہ غسل دینے والے کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔

کر کے صحبت اختیار کی جائے یہ تو فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ کے متعلق گفتگو تھی آگے ارشاد ہے وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ، اس کا حاصل یہ ہے کہ اور اپنے رب ہی کی طرف رغبت اور توجہ کیجئے اس جملہ کے متعدد مسائل ہیں۔

توجہ الی اللہ اصل مطلوب ہے

ایک تو یہ کہ توجہ الی اللہ اصل مطلوب ہے اور توجہ الی الخلق گو وہ دین ہی ہو اصل مطلوب نہیں بلکہ مطلوب بالغیر ہے کیونکہ یہاں جس توجہ الی الخلق سے فراغ حاصل کرنے اور اس سے فارغ ہو کر رغبت الی اللہ میں مشغول ہونے کا امر ہے وہ توجہ الی الخلق بھی دین ہی تھی اس لیے کہ نبی کی توجہ الی الخلق افادہ خلق کے لیے ہوتی ہے اور افادہ خلق دین ہے(۱) اور یہاں سے بعض صوفیہ کے اس قول کی اصل معلوم ہوگئی کہ ولایت نبوت سے افضل ہے جس کا یہ مطلب نہیں کہ ولی نبی سے افضل ہوتا ہے جیسا کہ بعض حکما نے سمجھا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ نبی میں جو دو شانیں ہوتی ہیں ایک ولایت کی اور ایک نبوت کی تو نبی کی ولایت نبی کی نبوت سے افضل ہوتی ہے چنانچہ دیکھ لیجئے کہ نبی کی توجہ الی افادۃ الخلق من حیث النبوت تھی اور توجہ الی اللہ من حیث الولایت مگر یہاں حق تعالیٰ توجہ الی الافادہ کو بمقابلہ توجہ الی اللہ غیر مقصود بالذات بتلا رہے ہیں پس ثابت ہوا کہ اصل مطلوب نبی کے لیے بھی توجہ الی اللہ ہے اور توجہ الی الافادہ مطلوب بالغیر ہے۔

بوقت فراغ مناسب معمول

دوسرے یہاں تقدیم معمول سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ فراغ کے وقت میں حق تعالیٰ کی طرف توجہ کلی ہونا چاہیے کہ اس وقت بجز حق تعالیٰ کے اور کسی چیز پر

(۱) نبی کی مخلوق کی طرف توجہ مخلوق کے فائدہ کے لیے تھی جو دین ہی ہے۔

توجہ نہ ہو کیونکہ تقدیم معمول حصر کو مفید ہوتا ہے تو مطلب یہ ہوا انصب الی ربك وحدہ لا ترغب الی شیٔ غیرہ ، کہ اس وقت صرف خدا تعالیٰ کی طرف توجہ کیجئے اور کسی چیز کی طرف التفات نہ کیجئے بس یہ حال ہو۔

چہ خوش ست با تو بزمے بہ نہفتہ ساز کردن درخانہ بند کردن سر شیشہ باز کردن (۱)

اور اس سے بھی توجہ الی اللہ کا مطلوب بالذات اور توجہ الی الخلق کا مطلوب بالغیر ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ توجہ الی اللہ میں توجہ خلق سے قطع نظر کا حکم ہے اور توجہ الی الخلق کے وقت یعنی تبلیغ کے وقت کہیں یہ حکم نہیں کہ صرف تبلیغ ہی پر توجہ ہو اور کسی کی طرف توجہ نہ ہو بلکہ اگر نصوص میں غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ تبلیغ کے وقت توجہ الی اللہ بھی مامور بہ ہے (۲)۔ بلکہ محققین نے تو تبلیغ کو بھی توجہ الی اللہ ہی فرمایا ہے مگر بواسطہ جیسے آئینہ میں سے صورت محبوب دیکھی جائے یہ بھی محبوب ہی کی رؤیت ہے (۳) کہ آئینہ کی رؤیت نہیں مگر یہ رؤیت بواسطہ ہے اور عاشق کا تو کام ہی محبوب کو دیکھنا ہے اگر کسی وقت رؤیت بلاواسطہ کی اجازت نہ ہو بلکہ آئینہ میں سے دیکھنے کا امر ہو تو وہ اسی کو غنیمت سمجھے گا اور کاملین کے لیے خلق مراۃ (۴) حق ہے ان کو اس میں بھی حق تعالیٰ ہی کا مشاہدہ ہوتا ہے غرض کامل توجہ الی الخلق میں بھی توجہ الی اللہ سے غافل نہیں ہوتے کیونکہ توجہ الی الخلق کے دو جزء ہیں ایک ذکر دوسرے طاعت اور وہ توجہ الی الخلق میں ان دونوں سے غافل نہیں ہوتے۔ ذکر سے تو اس لیے غافل نہیں ہوتے کہ کوئی کام ان کو یاد محبوب سے نہیں ہٹا سکتا ہر کام میں اور ہر حالت میں ان کا دھیان اسی کی طرف لگا رہتا ہے اور یہ کچھ عجیب وغریب بات نہیں عشق مجازی میں بھی اس حالت کا سب مشاہدہ کرتے ہیں دیکھئے اگر آپ کسی سردار پر عاشق ہوں اور اپنی ملاقات کے لیے کوئی وقت آپ کو بتلادے کہ فلاں وقت فلاں جگہ آجانا اور آپ اس کے لیے تیاری کریں غسل کا انتظام کریں، کپڑے عمدہ

(۱) ''کیا اچھا ہو کہ تو محفل میں اکیلا ہو گھر کا دروازہ بند اور شراب کا شیشہ کھلا ہو'' (۲) اللہ کی طرف توجہ کا بھی حکم ہے (۳) محبوب کا دیدار (۴) مخلوق تجلیات الٰہی کا آئینہ ہے۔

پہننے چاہیں اور غسل سے پہلے حجامت بنوائیں تاکہ آدمیوں کی سی صورت ہو وحشیانہ شکل نہ ہو تو سچ بتلایئے کہ عین حجامت اور غسل سے تبدیل لباس کے وقت آپ کا دھیان محبوب کی طرف ہوگا۔ یقیناً آپ یہ سب کام کریں گے مگر دل اسی کے دھیان میں ہوگا، پھر سالکین وکاملین کی حالت پر آپ کو کیوں تعجب ہے اگر ان کو بھی ہر کام میں محبوب کی طرف دھیان رہے مولانا فرماتے ہیں:

عشق مولیٰ کے کم از لیلی بود گوئے گشتن بہراد اولی بود(۱)

اور شیخ فرماتے ہیں:

ترا عشق ہمچوں خودے زآب وگل ربایدہمہ صبر وآرام ودل
عجب داری از سالکان طریق کہ باشند در بحر معنی غریق
دمادم شراب الم درکشند وگر تلخ بینند دم در کشند
چو سلطان عزت علم برکشد جہاں سر بجیب عدم برکشد(۲)

ذکر اللہ اور تجارت

جن پر یعنی جن کے دلوں پر حق تعالیٰ کی تجلی ہوتی ہے وہ بھلا کسی اور کی طرف کیونکہ توجہ کر سکتے ہیں وہ بلاشبہ توجہ الی الخلق میں بھی مشاہدہ حق کرتے ہیں مگر لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی۔ چنانچہ بعض لوگوں کو ﴿لَا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ﴾ (۳) پر شبہ ہوتا ہے کہ یہ کیونکر ہوسکتا ہے عین بیع وتجارت کے وقت ذکر اللہ سے غفلت نہ ہو اور اللہ کی طرف دھیان رہے میں نے کہا کہ یہ اس طرح ہوسکتا ہے جیسے تم عین ذکر اللہ کے وقت تجارت کے حساب وکتاب

(۱) ''مولیٰ کا عشق کیا لیلیٰ کے عشق سے بھی کم ہے۔ گیند بنانا اس کے لیے زیادہ بہتر ہے'' (۲) ''تجھے عشق اپنے جیسے مٹی اور پانی والے کا دل سے صبر اور آرام لے جاتا ہے۔ تعجب رکھتا ہے تو سالکان طریق سے جو کہ معنی کے درمیان میں غرق ہو۔ دمبدم رنج کی شراب پیتے ہیں اگر کڑوا دیکھتے ہیں خاموش ہوجاتے ہیں۔ اگر عزت کا بادشاہ جھنڈا بلند کرے ساری دنیا ناپید ہوجاتی ہے'' (۳) ''انہیں تجارت اور بیع اللہ کی یاد سے غافل نہیں کرتی''۔

سے غافل نہیں ہوتے اور نماز کے وقت بھی تجارت وغیرہ کے دھیان میں رہتے ہو نظیر تو موجود ہے پھر حیرت کیوں ہے۔ بھائی جس طرح تم کو ذکر اللہ تجارت سے غافل نہیں کرتا اور نماز کے اندر تجارت کا حساب کرتے ہو ایسے ہی ان کو تجارت ذکر اللہ سے غافل نہیں کرتی وہ تجارت میں بھی اللہ کی یاد کا حساب کرتے رہتے ہیں۔ بس بات یہ ہے کہ جو چیز دل میں پیوستہ ہوجاتی ہے اس سے کوئی چیز حاجب ومانع نہیں ہوتی تمہارے دل میں دنیا پیوست ہوگئی ہے اس لیے تم کو ذکر اللہ دنیا کی یاد سے اور اسکے دھیان سے مانع نہیں ہوتا اور اہل اللہ کے دل میں اللہ کی محبت پیوستہ ہوگئی ہے ان کو کوئی چیز اور کوئی کام ان کی یاد سے مانع نہیں ہوتا یہ تو ذکر کی حالت ہے کہ توجہ الی الخلق میں بھی وہ ذاکر ہوتے ہیں۔ اور طاعت کی حالت یہ ہے کہ وہ ہر کام میں احکام شرعیہ کی رعایت کرتے ہیں چنانچہ تبلیغ میں بھی جس میں ظاہراً تعلق مع الخلق ہے اس کی رعایت کرتے ہیں جس سے وہ تعلق مع الخالق ہوجاتا ہے۔ چنانچہ تبلیغ میں وہ نرمی کرتے ہیں سختی اور درشتی نہیں کرتے مگر اسی وقت تک جب تک محبوب کی شان میں کوئی گستاخی نہ کرے اور جب مخاطب محبوب کی شان میں گستاخی کرنے لگے پھر ان سے زیادہ غصہ اور کوئی نہ ہوگا۔

حرمات الٰہیہ کی ہتک

حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ذات کے واسطے کبھی انتقام نہیں لیا۔ ہاں جب حرمات الٰہیہ کی ہتک ہوتی ہو تو پھر آپ سے زیادہ غصہ دار کوئی نہ تھا۔ اس وقت آپ اللہ کے واسطے انتقام لیتے تھے اور غزوہ بدر میں جب ستر کفار قید ہوکر آئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے ان کے متعلق مشورہ لیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

یہ سب ائمۃ الکفر ہیں سب کو قتل کر دیا جائے اور ہر مسلمان کے حوالے اس کا کافر عزیز کیا جائے ہر شخص اپنے عزیز کو اپنے ہاتھ سے قتل کرے تاکہ سب دیکھ لیں کہ ہم اللہ تعالیٰ کی محبت کے سامنے اپنے کسی عزیز کی محبت کی پروانہیں کرتے پس جب انتہاک حرمات اللہ (۱) ہوتا ہو اس وقت یہ حضرات اپنے کسی عزیز کی بھی پروانہیں کرتے۔ اور اس وقت ان کی درشتی اور سختی بھی سب حق کے لیے ہوتی ہے۔ اور جب دین کا ہتک نہ ہو تو پھر وہ نرمی اور خوش اخلاقی سے تبلیغ کرتے ہیں۔ غرض حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تبلیغ بھی توجہ الی اللہ ہی تھی کیونکہ آپ توجہ الی الخلق میں بھی ذکر اللہ اور اطاعت میں مشغول تھے مگر حق تعالیٰ نے اس توجہ کو بھی مقصود بالذات نہیں قرار دیا بلکہ اصل مقصود اور مطلوب بالذات توجہ الی اللہ بلا واسطہ ہے لیکن حکمتوں کی وجہ سے یہ توجہ بواسطہ یعنی توجہ الی الخلق بھی مشروع کی گئی تاکہ دوسروں کو بھی ایسا بنایا جائے کہ وہ توجہ الی اللہ بلا واسطہ کے اہل ہو جائیں۔

توجہ الی الخلق سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حال

اگر حضور ﷺ تبلیغ نہ فرماتے اور مخلوق پر توجہ نہ فرماتے تو بتلائیے آج ہمارا کیا حال ہوتا مگر باوجود اس کے کہ آپ کی توجہ الی الخلق محض دین تھی اور افادہ خلق کے لیے تھی پھر بھی اس توجہ کی وجہ سے حضور ﷺ کی حالت یہ تھی کہ آپ توجہ بلا واسطہ مقابلہ میں اس توجہ بواسطہ کے متعلق فرماتے ہیں انہ لیغان علی قلبی (۲) ''کہ میرے دل پر بھی کسی وقت ابر سا چھا جاتا ہے'' اس کی شرح میں علماء ظاہر تو تھک گئے مگر صوفیہ جو اہل اسرار ہیں انہوں نے آگے بڑھ کر تفسیر یہ کی ہے کہ اس غین سے مراد وہ گرانی ہے جو توجہ الی الخلق میں آپ پر ہوتی تھی کیونکہ حضور ﷺ کا

(۱) حرمات الٰہیہ کی توہین (۲) الصحیح لمسلم، الذکر: ۴۱، مشکوۃ المصابیح: ۲۳۲۴

طبعی تقاضہ توجہ بلا واسطہ کا تھا توجہ بواسطہ طبعاً گراں تھی نہ اس وجہ سے کہ یہ وسائط آپ کے لیے معاذ اللہ مانع عن الحق تھے ہرگز نہیں آپ کی شان تو بہت بڑی ہے اور ادنیٰ درجہ کا صوفی یوں کہتا ہے۔

ہرچہ بینم درجہان غیر تونیست یا توئی یا خوئے تو یا بوئے تو(۱)

جب ایک ادنیٰ صوفی کے لیے تمام جہان مرآۃ حق ہے(۲) اور اسکی کوئی چیز حق سے مانع نہیں ہے تو رسول اللہ ﷺ کے متعلق یہ کس کی مجال ہے جو توجہ الی الخلق کو آپ کے حق میں توجہ حق سے مانع کہہ سکتے نہیں بلکہ بات وہی ہے کہ آپ کا اصلی تقاضا توجہ بلا واسطہ کا تھا۔ آپ کا دل یہی چاہتا تھا کہ حضرت حق کی طرف بلا واسطہ توجہ کروں اور توجہ الی الخلق میں بھی گو توجہ الی الخالق تھی مگر بواسطہ تھی یہ واسطہ آپ پر گراں تھا مگر حکمت کی وجہ سے حق تعالیٰ نے آپ کو توجہ الی الخلق کا مامور کیا تا کہ مخلوق کی اصلاح ہو اسی کو دوسری آیت میں فرماتے ہیں: والی ربك فارغب ، یعنی جب آپ تبلیغ وافادہ خلق سے فارغ ہو جائیں(۳) تو اب صرف خدا تعالیٰ کی طرف توجہ فرمائیے جو آپ کا اصلی تقاضا ہے اور وہی مطلوب بالذات ہے بہر حال اس جملہ سے یہ مسئلہ مستنبط ہوا کہ فارغ وقت میں جب حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہو تو اس وقت صرف حق تعالیٰ ہی کی طرف توجہ کرو اس وقت توجہ بواسطہ نہ ہونا چاہیے بلا واسطہ ہونا چاہیے اگر تنہائی میں بھی یہ واسطے باقی رہے تو وقت ہی ضائع کیا آخر پھر توجہ بلا واسطہ کا کونسا وقت ہوگا اسی کو شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

چو ہر ساعت از تو بجائے رودول بہ تنہائی اندر صفائے نہ بینی

گرت مال وزر ہست زرع وتجارت چو دل بخدا ہست خلوت نشینی(۴)

(۱) ”دنیا میں جو کچھ دیکھتا ہوں سوائے تیرے نہیں ہے یا تو خود ہے یا تیری عادت ہے یا تیری خوشبو ہے“
(۲) حق کا آئینہ (۳) مخلوق کو فائدہ پہنچانے سے جب فارغ ہو جائیں (۴) ”جو ہر گھڑی تیرا دل بھاگا بھاگا پھرے تو تنہائی کے اندر بھی صفائی نہ دیکھے گا اور اگر تیرے پاس مال اور سونا ہے اور زراعت اور تجارت ہے جب تیرا دل خدا کے ساتھ ہے تو خلوت میں بیٹھنے والا ہے“۔

یعنی اگر صورۃ خلوت ہو مگر قلب تعلقات میں گرفتار ہو تو اس خلوت کا کچھ فائدہ نہیں اور اگر مال وزر اور کھیتی اور تجارت میں بھی دل خدا تعالیٰ کے ساتھ لگا ہوا ہو تو تم جلوت میں بھی خلوت نشین ہو اسی مضمون کو ایک دوسرے بزرگ فرماتے ہیں۔

گر باہمہ چو با منی بے ہمہ در بے ہمہ چو بے منی باہمہ (۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا نماز میں انتظام لشکر کشی

پس کم از کم خلوت میں تو ایسی توجہ ہونا چاہیے کہ اس وقت دل خیالات غیر سے پاک ہو ورنہ وہ خلوت خلوت نہ ہوگی بلکہ جلوت ہوگی البتہ اگر ایسا خیال ہو جس کی اجازت محبوب کی طرف سے ہو یعنی دین کا ہو اور ضرورت کا ہو تو وہ خلوت کے منافی نہیں (۲) اور ایسا خیال قرب مقصود کے خلاف نہیں ہے۔ اس خیال کی ایک نظیر وہ ہے جس کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ انی لا جھز جیشی وانا فی الصلوٰۃ کہ میں نماز میں لشکر کشی کا انتظام کرتا ہوں وجہ اس کی یہ تھی کہ یہ بھی دین ہی کا کام تھا اور ضروری تھا۔ اور ذکر اللہ وما والاہ، میں داخل تھا کیونکہ اس سے مجاہدین کے ذکر کی تکمیل ہوتی ہے۔ اور غافلوں کو ذاکر بنا کر اس سے کثرت ذاکرین کی تحصیل ہوتی ہے اور کثرت مشاغل کے سبب خارج نماز اوقات بعض دفعہ اس کے لیے کافی نہ ہوتے تھے اور نماز میں یکسوئی ہوتی ہے اور تدبیر وانتظام کا کام محتاج یکسوئی تھا اس لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز میں بضرورت یہ کام کر لیتے تھے۔

مشورے کا طریقہ

اور یہاں سے غلطی معلوم ہوئی ان لوگوں کی جو آج کل مشوروں کے لیے جلسے کرتے پھرتے ہیں بھلا مشورہ بھی کہیں جلوس میں ہوا کرتا ہے۔ صاحب مشورہ

(۱) ''اگر تو تمام مخلوق کے ساتھ ہو اور دل میرے ساتھ ہو تو تو بغیر سب کے ہے۔ اور اگر تو بغیر سب کے ہے اور میرے ساتھ نہیں تو تو سب کے ساتھ ہے'' (۲) خلوت کے خلاف نہیں۔

کے لیے یکسوئی اور اجتماع قوت فکر یہ کی ضرورت ہے اور مجمع کثیر میں قوت فکر یہ کیسے مجتمع ہوگی۔ صاحبو! ایسے مہمات میں نظر کرنے کا طریقہ تو حق تعالیٰ نے خود قرآن میں ہم کو بتلا دیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے: اَعِظُكُمْ بِوَاحِدَةٍ اس میں کفار کو رسالت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کی حقانیت معلوم کرنے کا طریقہ بتلایا گیا ہے کہ میں تم کو ایک بات کی نصیحت کرتا ہوں اَنْ تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰى وَفُرَادٰى کہ تم اللہ کے واسطے دو دو اور تنہا تنہا کھڑے ہو جاؤ یعنی آمادہ ہو جاؤ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا مَا بِصَاحِبِكُمْ مِّنْ جِنَّةٍ، پھر سوچو کہ تمہارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو جنون ہے یا نہیں تو تمہارا دل اس وقت یہی کہے گا کہ جنون نہیں ہے۔ اس میں سوچنے کا خاص طریقہ بتلایا گیا جس کے یہ اجزاء ہیں ایک یہ اہتمام کرو دوسرے یہ کہ یہ اہتمام اللہ کے لیے یعنی خلوص سے ہو تیسرے یہ کہ فکر کرو چوتھے یہ کہ مجمع نہ ہو کہ اس سے فکر میں تشتت ہوتا ہے یا تو اس کو اکیلے سوچو یا کوئی دقیق بات ہو تو ایک کو اور شریک کر لو اور ایک کی تحقیق نہیں مطلب یہ کہ اتنا تعدد ہو جو مشوش (۱) فکر نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو کام یکسوئی کے محتاج ہیں وہ جلسوں میں طے نہیں ہو سکتے مگر آج کل لوگ عام طور پر اس غلطی میں مبتلا ہیں کہ مشورہ کے لیے جلسے کرتے ہیں جس میں ہزاروں آدمی ہوتے ہیں بھلا اس طرح مشورہ کیا خاک ہوگا غرض حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ خلوت میں جلوت چونکہ باذن (۲) حق تھی اس لیے اِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ کے منافی نہ تھی خوب سمجھو۔

وساوس کا حکم

تیسرا مسئلہ اس سے یہ مستنبط ہوا کہ اِلٰى رَبِّكَ فَارْغَبْ میں توجہ الی اللہ کا امر فرمایا گیا ہے اور قاعدہ شرعیہ ہے کہ اوامر میں حد اختیار تکلیف ہوتی ہے اور جو درجہ

(۱) صرف اتنی تعداد ہو جو تشویش کا شکار نہ ہو سکے (۲) اللہ کے حکم سے۔

حد اختیار سے خارج ہو وہ مکلّف بہ نہیں ہوتا(۱) یہاں تک کہ ایک بڑا مسئلہ حل ہوا وہ یہ کہ اگر کسی کو نماز وذکر میں وساوس بے اختیار آتے ہوں خواہ اپنے کاروبار کے وساوس یا کوئی مرد کسی عورت پر یا امرد پر (جس کے لفظی معنی تو بڑے مرد کے ہو سکتے ہیں کیونکہ یہ مرد کا افعل التفضیل ہے اور حقیقت میں وہ چھوٹا مرد ہے) فریفتہ ہو گیا ہو اور اس کی طرف دل کو ہٹانا چاہتا ہو لیکن اضطراراً بلا اختیار اس کا خیال نماز وذکر میں آجاتا ہو تو یہ مضر نہیں(۲) اس میں بہت لوگ مبتلائے غم ہیں(۳) اور ان وساوس سے پریشان ہوتے ہیں تو وہ مطمئن رہیں کہ یہ خیالات اضطراریہ(۴) توجہ کامل کے منافی نہیں ان سے کچھ ضرر نہیں ہوتا البتہ اختیاری وساوس نہ ہوں۔ جن میں یہ مضطر نہیں(۵)۔ غرض کمال توجہ الی اللہ کے منافی وہ وساوس وخیالات ہیں جو اختیاری ہوں اگر وہ وساوس اختیاریہ مباحات کے درجہ میں ہیں تو ان سے گناہ تو نہ ہوگا البتہ ذکر ناقص ہوگا اور اگر تصورات محرمہ(۶) ہیں تو ان سے گناہ بھی ہوگا چنانچہ نص میں وارد ہے۔ ﴿ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ ﴾ ''اور اللہ تعالیٰ جانتے ہیں آنکھوں کی خیانت کو اور جو تمہارے سینوں میں چھپا ہے'' اور ﴿ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ﴾(۷) ان آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ وساوس پر بھی مواخذہ ہوگا اگر حدیث نہ ہوتی تو ہم ان نصوص کو عام ہی سمجھتے کیونکہ مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اور مَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (۸) میں لفظ ''ما'' عام ہے۔ لیکن حدیث سے تفسیر معلوم ہوئی کہ مراد وساوس اختیاریہ ہیں جو درجہ عزم میں ہوں اور اب حدیث سے مسئلہ منکشف ہونے کے بعد تو خود آیت کے الفاظ پر نظر کرکے بھی یہی مفہوم ہوتا ہے کہ مراد اختیاری خیالات ہیں

(۱) جن احکام کا انسان کو حکم دیا جاتا ہے اس میں اس بات کا لحاظ ہوتا ہے کہ انسان کی طاقت سے وہ کام باہر نہ ہو (۲) نقصان دہ نہیں (۳) پریشان ہیں (۴) ایسے خیالات جو غیر اختیاری ہوں (۵) مجبور نہیں (۶) جن کا تصور کرنا حرام ہے (۷) ''اور اگر تم ظاہر کرو جو تمہارے دلوں میں ہے یا اسے چھپاؤ اللہ تم سے اس کا حساب لیں گے'' البقرۃ: ۲۸۴ (۸) جو تمہارے دل میں پوشیدہ ہیں حکم عام ہے۔

کیونکہ ابداء واخفاء(۱) افعال اختاریہ ہیں۔ جن کا تعلق افعال اختیاریہ ہی سے ہوگا اور اس کے بعد لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا (البقرۃ:۲) (اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی حیثیت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے) نے مطلب کو بالکل صاف کر دیا کہ وسعت سے زیادہ تکلیف نہیں اور وساوس اضطراریہ وسعت سے خارج ہیں۔ بعض لوگوں کو ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾(۲) سے شبہ ہوا ہے کہ اس سے متعلق وسوسہ پر مواخذہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ محاورات قرآنیہ سے اکثر جگہ اخبار عن العلم سے وعید ہی مقصود ہوتی ہے۔

آیت کی تشریح

مگر سیاق وسباق میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں مواخذہ کا ذکر نہیں بلکہ دراصل یہاں اوپر سے اثبات معاد کا ذکر ہے جس کے لیے اثبات قدرت علم کی ضرورت ہے تو حق تعالیٰ نے اول قدرت کو بیان فرمایا ہے کہ ہماری قدرت کامل ہے چنانچہ اوپر فرمایا ہے ﴿اَفَلَمْ یَنْظُرُوْٓا اِلَی السَّمَآءِ فَوْقَھُمْ کَیْفَ بَنَیْنٰھَا وَزَیَّنّٰھَا وَمَا لَھَا مِنْ فُرُوْجٍ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰھَا وَاَلْقَیْنَا فِیْھَا رَوَاسِیَ وَاَنْۢبَتْنَا فِیْھَا مِنْ کُلِّ زَوْجٍ م بَھِیْجٍ(۳) الی قولہ اَفَعَیِیْنَا بِالْخَلْقِ الْاَوَّلِ ط بَلْ ھُمْ فِیْ لَبْسٍ مِّنْ خَلْقٍ جَدِیْدٍ﴾(۴) اثبات قدرت کے بعد اب علم کامل کو ثابت فرما رہے ہیں ﴿وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِہٖ نَفْسُہٗ ۚ وَنَحْنُ اَقْرَبُ اِلَیْہِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِیْدِ﴾(۵)

(۱) ظاہر کرنا اور چھپانا فعل اختیاری ہے (۲) ''اور ہم نے انسان کو پیدا کیا اور اس کے جی میں جو خیالات آتے ہیں ہم ان کو جانتے ہیں اور ہم انسان کے اس قدر قریب ہیں کہ اس کی رگِ گردن سے بھی زیادہ'' (۳) ''کیا ان لوگوں نے اپنے اوپر کی طرف آسمان کو نہیں دیکھا کہ ہم نے اس کو کیسا اونچا اور بڑا بنایا اور ستاروں سے اس کو آراستہ کیا اور اس میں کوئی رخنہ تک نہیں اور زمین کو ہم نے پھیلایا اور اس میں پہاڑوں کو جمالیا اور اس میں ہر قسم کی خوشنما چیزیں اگائیں'' (۴) ''کیا ہم پہلی بار کے پیدا کرنے میں تھک گئے بلکہ یہ لوگ از سر نو پیدا کرنے کی طرف سے (محض بے دلیل) شبہ میں ہے'' (۵) کہ ہم نے انسان کو پیدا کیا ہے (اور اپنی پیدا کی ہوئی چیز کا علم ہم کو کیسے نہ ہوگا) اور ہم ان باتوں کو بھی جانتے ہیں جو اس کے دل میں گزرتی ہیں اور ہم رگ گردن سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں''۔

پس اب یہاں وَنَعْلَمُ مَا تُوَسْوِسُ بِهٖ نَفْسُه ایسا ہے جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے اَلَا یَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ کیا جس نے پیدا کیا وہ بھی (تم کو) نہ جانے گا (تو اور کون جانے گا یعنی خالق کو بالضرور مخلوق کا علم ہوگا) پس آیت کو مواخذہ سے کچھ تعلق نہیں اب اگر کسی کو یہ احتمال ہو کہ جس طرح اس آیت کا مواخذہ سے تعلق نہیں ممکن ہے کہ دوسری آیات کو بھی مواخذہ سے تعلق نہ ہو جن سے تم نے وساوس وخیالات اختیاریہ پر مواخذہ کو ثابت کیا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ وہاں قرائن سیاق وسباق سے مواخذہ پر دلالت مفہوم ہو رہی ہے(۱)۔

قلب کی تمنا اور اشتہا پر مواخذہ

اور اگر کوئی آیات سے نہ سمجھے تو حدیثوں میں تو یہ مسئلہ صاف طور پر مذکور ہے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں: ''العینان تزنیان وزناهما النظر والقلب یتمنی ویشتهی ویصدق ذلك الفرج او یکذبه ''(۲) اس میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آنکھ کے لیے بھی زنا ثابت فرمایا ہے اور قلب کے لیے بھی کہ آنکھ بھی زنا کرتی ہے۔ اس کا زنا دیکھنا ہے (بقصد شہوت) اور دل بھی زنا کرتا ہے اس کا زنا تمنا اور اشتہا ہے آگے فرج کے زنا کو الگ بیان فرمایا ہے اس سے صاف معلوم ہوا کہ قلب کی تمنا واشتہا پر بھی مواخذہ ہے مگر وہی جو بقصد ہو، جو بلا قصد تو وسوسہ زنا کیا کفر وشرک کے وساوس بھی مضر نہیں پس وساوس غیر اختیاریہ سے بالکل مطمئن رہو ان سے کچھ بھی ضرر نہیں ہوتا۔ میں اس مسئلہ کو تاکید وتوضیح کے ساتھ اس لیے بیان کر رہا ہوں کہ بہت لوگ اس کے نہ جاننے کی وجہ سے پریشانیاں اور وہم میں مبتلا ہیں اور اس میں عوام کو زیادہ ابتلاء نہیں زیادہ وساوس کے وہم میں آپ

(۱) مسند احمد ۲:۳۷۲، مجمع الزوائد ۶:۲۵۶۔

اتقیاء کو مبتلا دیکھیں گے کیونکہ شیطان اپنے وقت کو خراب نہیں کرتا ہے وہ بڑا جنٹلمین ہے کہ وہ بے ضابطہ اپنے وقت کو فضول ضائع نہیں کرتا بلکہ ضابطہ سے کام کرتا ہے۔ تو جن سے وہ گناہ بھی آسانی سے کراسکتا ہو ان کو وسوسے کیوں ڈالے اور خواہ مخواہ القاء وساوس میں اپنا وقت کیوں برباد کرے ہاں جن سے گناہ بلا واسطہ نہیں کراسکتا اور یہ اتقیاء ہیں جن سے اگر وہ زنا یا چوری کرانا چاہے تو جانتا ہے کہ وہ فوراً اس سے متوحش ہوں گے اور کبھی اس فعل پر جرات نہ کریں گے ان کو وہ عبادت کے وقت وساوس میں مبتلا کرتا اور اس طرح پریشان کرتا ہے تاکہ وساوس سے گھبرا کر یہ عبادات کو ترک کردیں چنانچہ بہت سے اتقیاء کو اس نے وساوس کے چکر میں ڈال کر عبادات وذکر سے معطل کردیا کیونکہ ان کی حالت یہ ہوگئی ویسے بیٹھے رہیں تو ایک وسوسہ بھی پاس نہیں آتا اور جہاں نماز وذکر میں مشغول ہوئے معاً وساوس کفر وشرک ومعاصی کے آنا شروع ہوئے پھر چونکہ وہ محقق نہ تھے اس لیے گھبرا گئے۔ اور نماز وذکر چھوڑ بیٹھے اور شیطان اپنے مقصود میں کامیاب ہوگیا، مگر جو محقق ہیں وہ اس سے نہیں گھبراتے کیونکہ ان کی نظر میں قرآن وحدیث ہے اور عمل بالقرآن ان کی طبیعت ثانیہ ہوگئی ہے ان میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس شان کا ظہور ہے ''کان خلقه القرآن ''(۱) وہ تو وساوس آنے کے وقت کہتے ہیں ''الحمد لله الذی رد کیده الی الوسوسة ''(۲) کہ خدا کا شکر ہے کہ دشمن کی سب چالیں ختم ہوکر وسوسہ ہی پر رہ گئیں وہ ان وساوس سے نہیں گھبراتا بلکہ شیطان سے کہتا ہے کہ آجتنے وسوسے ڈال سکے ڈال دے میرا کچھ ضرر نہیں ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ وسوسہ سے خوش ہونا چاہیے تاکہ شیطان تمہاری خوشی کو دیکھ کر بھاگ جائے کیونکہ اس کو مسلمان کی خوشی گوارا نہیں وہ تو رنج دینے کے لیے وسوسہ ڈالتا ہے پھر

(۱) مسند احمد: ۹۱۶، کنز العمال: ۱۸۳۷۸ (۲) سنن ابی داؤد: ۵۱۱۲، مسند احمد ۱: ۲۳۵

جب دیکھے گا کہ اس کو تو الٹی خوشی ہے بھاگ جائے گا۔

وساوس سے نجات کا سہل نسخہ

میں ایک بات اور کہتا ہوں وہ یہ کہ وساوس پر اس نیت سے خوش نہ ہو کہ اس خوشی سے وساوس دفع ہو جائیں گے کیونکہ شیطان ان نکتوں کو سمجھتا ہے جب وہ دیکھے گا کہ یہ دفع وساوس کے لیے تدبیر کر رہا ہے تو وہ کبھی نہ بھاگے گا بس اس کا سہل نسخہ یہی ہے کہ ان کی پرواہ ہی نہ کرے اور دفع کی نیت ہی نہ کرے اس جگہ میں سالکین سے ایک اور بات کہتا ہوں کہ تم مجاہدہ کرو مگر ثمرات کے منتظر نہ ہو کام میں لگے رہو اور شیطان کے جلدی بھاگنے کا انتظار نہ کرو کیونکہ وہ تم سے جلدی سے جلدی نہ بھاگے گا بلکہ وہ تو اس وقت بھاگے گا جب ذکر راسخ ہو جائے گا۔ اور ذکر کا راسخ ہونا ایک دو دن کا کام نہیں۔

صوفی نشود صافی تا در نکشد جامے بسیار سفر باید تا پختہ شود خامے(۱)

مگر آج کل یہ حالت ہے کہ جاھل اذا صلی یومین انتظر الوحی کہ کسی جاہل کی طرح دو دن تہجد پڑھ کر سمجھتے ہیں کہ بس اب ہم کامل ہو گئے اب شیطان ہمارے پاس نہیں آ سکتا ان کی وہی مثال ہے رات پڑی تھی بوند نام رکھا محمود (یہاں پہنچ کر عصر کی اذان ہو گئی تو فرمایا کہ اب میں ختم ہی کرنے والا ہوں نماز سے پہلے ہی بیان ختم کر دوں گا پھر خاموشی کے ساتھ اذان کا جواب دیتے رہے بعد اذان کے فرمایا) میں یہ عرض کر رہا تھا کہ وساوس بلا اختیار پر اور رغبت اضطراریہ الی الاجنبیہ (۲) وغیرہ پر مواخذہ نہیں بلکہ مواخذہ قصد پر ہے اگر قصداً وساوس لائے گا یا عمداً کسی مرد یا عورت کی طرف توجہ کرے گا تو گناہ ہوگا اور اسی پر مواخذہ ہے یہی مضر ہے رہا یہ کہ بلا اختیار اگر نامحرم کی طرف رغبت ہو یا وسوسہ آئے

(۱) ''صوفی صاف نہیں ہوتا جب تک کہ محبت کی شراب کا پیالہ نہیں پیتا۔ بہت سے سفروں کی ضرورت ہے جب کچا پکا ہوتا ہے'' (۲) غیر اختیاری وسوسے اور اجنبی عورت کی طرف غیر اختیاری رغبت پر گرفت نہیں۔

تو اس کا دفع مطلوب ہے یا نہیں عام کے ذہن میں جس میں علماء کالعوام (۱) کا ذہن بھی داخل ہے یہ کہ اس کا دفع مطلوب ہے اس لیے عام لوگ اس کے دفع کی کوشش کرتے ہیں مگر محققین فرماتے ہیں کہ دفع کے قصد سے بھی اس کی طرف توجہ نہ کرے بلکہ جب وسوسہ آئے اس وقت مقصود کی طرف توجہ کی تجدید کردے (۲) اور وسوسہ کے نہ احضار کا قصد کرے نہ دفع کا کیونکہ دفع بدون توجہ کے ہوگا نہیں تو دفع وسوسہ کا قصد کرنے سے اس کی طرف اور توجہ بڑھے گی۔ گھٹے گی نہیں پھر جب شیطان اس کو وسوسہ کی طرف متوجہ پائے گا تو اور زیادہ وسوسہ ڈالے گا بس اس کی ایسی مثال ہے جیسے تار برقی (۳) کہ اگر اس کو اپنی طرف قریب کرنے کی نیت سے پکڑو جب بھی چمٹتا ہے اور دفع کی نیت سے پکڑو جب بھی چمٹتا ہے بس سلامتی اسی میں ہے کہ اس کو پکڑو ہی نہیں نہ جلب کے لیے نہ دفع کے لیے بس اپنے کام میں لگے رہو اور اگر کوئی یہ کہے کہ یہ تدبیر مذکور کافی نہیں کیونکہ اجنبیہ کا خیال نہ توجہ الی اللہ سے دفع ہوتا ہے نہ اس خیال کی طرف بے التفاتی برتنے سے تو میں کہتا ہوں کہ تم غم نہ کرو ان شاء اللہ اسی طرح رفتہ رفتہ ایک دن دفع ہوجائے گا اور اگر عمر بھر بھی دفع نہ ہو تو تم اس تدبیر کے کرنے کے بعد سبکدوش ہوگئے اب تم کو اس خیال سے کچھ ضرر نہیں (۴) بلکہ نافع ہوگا کیونکہ تم مجاہدہ میں مشغول ہو اور میرے اس دعویٰ کی دلیل ایک حدیث ہے جس کو مختلف طرق سے روایت کیا گیا ہے جن میں سے بعض طرق میں ایک وضاع (۵) بھی ہے مگر سب میں نہیں ہے ہاں ضعیف (۶) سب طرق ہیں مگر اس کا مضمون قواعد شرعیہ کے موافق ہے اس لیے ضعف بھی منجبر ہوگا (۷)

(۱) وہ علماء جو عوام کی طرح ہیں (۲) مقصود کی طرف توجہ کرے نہ وسوسہ کی طرف توجہ کرے اور نہ اس کو دور کرنے کا ارادہ کرے (۳) بجلی کی تار (۴) نقصان (۵) ایک راوی ایسا ہے جس پر حدیثیں گھڑنے کا الزام بھی ہے (۶) کمزوری سب سندوں میں ہے (۷) لیکن قواعد شرعیہ کے مطابق ہے اس لیے روایت کے ضعیف ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا یہ حکم ثابت ہوگا۔

عفت قلب کا مفہوم

وہ حدیث یہ ہے: ''من عشق فعف و کتم فمات فھو شھید ''(۱) جو کسی پر عاشق ہو گیا پھر اس نے عفت اختیار کی اور اپنے عشق کو چھپایا وہ شہید ہے۔ عفت کی قید تو شرعاً لازم ہے ہی جس میں عفت جوارح وعفت قلب داخل ہیں (۲) اور عفت قلب سے مراد وہی ہے کہ بالاختیار اور بالقصد خیال نہ لائے اور کتمان (۳) اس لیے ضروری ہوتا ہے کہ معشوق رسوا نہ ہو (۴) کیونکہ عشق کی شہرت کے بعد لوگ ان دونوں کے متعلق مختلف گمان پکانے لگتے ہیں تو خواہ مخواہ اظہار عشق کر کے دوسرے کو کیوں رسوا کیا کہ ہم تو ڈوبیں گے مگر تجھ کو بھی لے ڈوبیں گے۔ دوسرے کتمان (۵) اس لیے بھی ضروری ہے کہ دوسرے لوگ اس معشوق پر عاشق نہ ہو جائیں کیونکہ تجربہ ہے کہ بعض دفعہ ایک شخص کو سو دفعہ کسی نے دیکھا ہو مگر کسی کا اس کی طرف التفات نہیں ہوا اور جہاں یہ سنا کہ اس پر کوئی عاشق ہے اب لوگوں کو اس کے محاسن کی طرف التفات شروع ہوا کہ دیکھیں اس میں کیا وصف ہے جس کی وجہ سے فلاں شخص عاشق ہو گیا۔ التفات کا ہونا غضب تھا کہ اب بہت سے عاشق، اول اپنے عشق کو ظاہر کر کے سوتے ہوئے فتنہ کو جگانا اور خالی الذہن آدمیوں کو اس کی طرف متوجہ کرنا اور اپنی بلا میں سینکڑوں کو مبتلا کر دیتا ہے۔ پھر کوئی صورت پر عاشق ہوتا ہے کوئی ناز و انداز پر عاشق ہوتا ہے کوئی اخلاق و عادات پر فریفتہ ہوتا ہے۔ غرض اب وہ اس شعر کا مصداق ہو جاتا ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ می دارد برنگ اصحاب صورت را ببو ارباب معنی را(۶)

(۱) اتحاف السادۃ المتقین: ۷/ ۴۳۹، الدرر المنتشرہ لاحادیث المنتشرہ ۱۵۲ (۲) جس میں دل اور اعضاء سب کی پاکدامنی شامل ہے یعنی نہ تصور سے لذت حاصل کرے نہ ملے جلے (۳) عشق کو پوشیدہ رکھنا (۴) معشوق کی بدنامی نہ ہو (۵) پوشیدگی (۶) ''اس کے عالم حسن کی بہار دل اور جان کو تازہ کرتی ہے۔ صورت والے اس کے رنگ کو دیکھ کر خوش ہوتے ہیں اور اہل معنی اس کی خوشبو سونگھ کر راضی ہوتے ہیں''۔

اس لیے کتمان کی سخت ضرورت ہے۔ اب اگر عفت و کتمان (۱) کے بعد بھی عشق کا زخم دل سے نہ گیا اور برابر اسی خیال میں گھلتا رہا تو یہ شخص شہید ہے کیونکہ صاحب مجاہدہ عظیمہ ہے جب تپ کہنہ (۲) کا کھلا ہوا مریض یعنی مدقوق شہید ہے تو تپ عشق کا مارا ہوا تو ضرور ہی شہید ہوگا (۳) کیونکہ حرارت حمی سے حرارت عشق اشد ہے (۴)۔

نفع لازمی نفع متعدی سے افضل ہے

چوتھا مسئلہ اس آیت سے یہ مستنبط ہوا کہ یہ جو مشہور ہے کہ نفع متعدی نفع لازمی سے افضل ہے یہ علی الاطلاق صحیح نہیں بلکہ اصل یہی ہے کہ نفع لازمی نفع متعدی سے افضل ہے کیونکہ آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو امر ہے کہ جب آپ نفع متعدی سے فارغ ہو جائیں یعنی تبلیغ سے تو نفع لازمی میں مشغول ہوں یعنی توجہ الی اللہ میں۔ یہ سیاق صاف بتلا رہا ہے کہ نفع لازمی متعدی سے افضل ہے کیونکہ متعدی سے فراغ کو طلب کیا گیا ہے نہ کہ لازمی سے پھر اس کے بعد نفع لازمی میں اشتغال کلی کا حکم ہے کہ اسی میں توجہ رکھئے اس وقت دوسری طرف التفات نہ ہوں جیسا ''الی ربك '' کی تقدیم کا مقتضا ہے (۵) اور ظاہر ہے کہ اگر نفع متعدی افضل ہوتا تو اس سے فراغ مطلوب نہ ہوتا بلکہ یوں ارشاد ہوتا ''فاذا فرغت من ذکر ربك فانصب فی التبلیغ والیه فارغب ''نیز نفع لازمی میں مشغول ہونے کے وقت نفع متعدی سے قطع نظر کا امر ہوتا جیسا تقدیم معمول کا مدلول ہے کیونکہ مقصود بالذات سے کسی وقت قطع نظر نہیں ہوا کرتی (۶) اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ نفع متعدی مقصود بالعرض اور نفع لازمی مقصود بالذات

(۱) پاکدمنی اور پوشیدگی کے باوجود (۲) پرانے بخار میں مبتلا ہو کر دق کی وجہ سے مرنے والا شہید ہے (۳) عشق کے بخار کی وجہ سے مرنے والا تو ضرور شہید ہوگا (۴) بخار کی گرمی سے عشق کی گرمی زیادہ سخت ہے (۵) ''الی ربك'' کی قید سے معلوم ہو رہا (۶) جو چیز مقصود بالذات ہو اس سے کبھی صرف نظر نہیں کیا جا سکتا۔

ہے۔ اور گو یہ مشہور کے خلاف ہے(۱) مگر حقیقت یہی ہے اور قول مشہور کا منشا یا تو یہ ہے کہ بعض جگہ نفع متعدی لازمی سے اور مقدم ہوگیا ہے مگر اس سے افضلیت بالذات لازم نہیں آتی بلکہ اقدمیت واوکدیت ایک (۲) عارض کی وجہ سے ہوئی ہے کہ نفع متعدی پھر نفع لازمی کی طرف مفضی ہوگا کہ دوسرا شخص بھی رغبت الی اللہ کرے گا اور ذکر وصلوٰۃ میں مشغول ہوگا اور اگر اس پر کوئی یہ شبہ کرے کہ شاید نفع متعدی اس لیے شروع ہوا ہوتا کہ وہ نفع لازمی کے بعد متعدی کی طرف مفضی ہو اس طرح کہ دوسرا شخص بھی اپنی اصلاح کر کے تبلیغ کے قابل ہوگا تو اس کا جواب یہ ہے کہ اولاً تو تبلیغ کے قابل بھی وہ نفع لازمی حاصل کرنے کے بعد ہوگا کیونکہ جس کی خود اصلاح نہ ہوئی ہو وہ دوسروں کی اصلاح نہیں کرسکتا پھر دوسرے کو تبلیغ کے قابل ہونا یعنی نہیں کیونکہ بعض لوگ اصلاح وتکمیل غیر کے اہل نہیں ہوتے اور نفع لازمی کا اہل ہر شخص ہے۔ پس نفع متعدی پر نفع لازمی کا ترتب تو یقینی ہے کہ آج ہی سے اس کا ترتب شروع ہوجاتا ہے اور نفع متعدی کا ترتب موہوم ہے کہ نہ معلوم یہ دوسروں کی اصلاح کے قابل ہوگا یا نہیں اور تجربہ ہے کہ دوسروں کی اصلاح کے قابل سو میں سے ایک دو ہوتے ہیں پھر قابل ہوا بھی تو نہ معلوم کب ہوگا اور ہو بھی گیا تو نہ معلوم اس کو اصلاح غیر کی نوبت آئے گی یا نہیں کیونکہ بہت سے سالک نفع متعدی کے قابل ہوتے ہیں مگر ان کو اس کی نوبت ہی نہیں آتی یا کم آتی ہے تو ایسے نفع موہوم (۳) کے لیے کسی شے کا ایسا مشروع ہونا (۴) کہ وہ مقصود بالذات ہوجائے از بس بعد ہے (۵)۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ بالعرض یہ بھی مقصود ہوجائے لیکن مقصود بالذات وہی نفع ہوسکتا ہے جس کا ترتب یقینی ہو اور اس کا ظہور بھی موہوم نہ ہوا اور

(۱) مشہور تو یہ ہے کہ نفع متعدی افضل ہے (۲) یہ بات مشہور ہونے کی وجہ یہ ہے کہ نفع متعدی کی تاکید یا اس کو پہلے ادا کرنے کا اہتمام کسی عارض کی بنا پر ہوتا ہے جو یہ ہے کہ نفع متعدی سے پھر نفع لازم ہی حاصل ہوتا ہے (۳) خیالی نفع (۴) شریعت میں حکم دیا جانا (۵) بہت دور کی بات ہے۔

وہ نفع لازمی جو نفع متعدی پر فوراً ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

مریدین کے مراتب

دوسرے اگر نفع سے مقصود نفع متعدی ہوگا تو طالب کو اس مقصودیت کی اطلاع کے بعد اس کے قصد کی اجازت بھی ہوگی کیونکہ مقصود کا ارادہ بھی مقصود ہوتا ہے۔ اور مقصود کی نیت مضر ہو تو ہو ہی نہیں سکتی مگر شیوخ محققین سے جو کہ مجتہدین فن ہیں جن کا فتویٰ قواعد فن سے حجت ہے ان سے پوچھئے کہ وہ طالب کو نفع متعدی کی نیت کی اجازت دیتے ہیں یا نہیں وہ فرماتے ہیں کہ طالب اگر ذکر و شغل سے مخلوق کو نفع پہنچانے کا قصد کرے گا تو وہ کبھی فتح یاب نہ ہوگا یہ ارادہ رہزن طریق ہے(۱) اپنی اصلاح کے زمانہ میں اس کو صرف اپنی اصلاح کا قصد کرنا چاہیے دوسروں کی اصلاح کا خیال مانع طریق بلکہ قاطع طریق ہے(۲) اس سے اپنی اصلاح کے لالے پڑ جاتے ہیں تو یہ اچھا مقصود بالذات ہوا جس کا قصد کرنا رہزن طریق ہے اب بتلائیے اس حالت میں نفع متعدی کو افضل اور مقصود بالذات کیسے کہہ سکتے ہیں۔ پھر اپنی اصلاح و تکمیل کے بعد بھی ہر شخص کو نفع متعدی کی اجازت نہیں بلکہ اس کا اہل صرف وہی ہے جس کو مشائخ نے اجازت دی ہو اگر نفع متعدی اصل ہے اور یہی مقصود بالذات ہے تو تکمیل کے بعد اس کو از خود نفع متعدی میں مشغول ہونے سے کیوں روکا جاتا ہے اور اجازت شیخ کی قید کیوں لگائی جاتی ہے یہ بھی اس کی دلیل ہے کہ نفع متعدی مقصود بالذات نہیں ورنہ لازم آتا ہے کہ جن لوگوں کو نفع متعدی کی اجازت نہ دی گئی ہو وہ سب کے سب ناقص ہی ہوں حالانکہ مشائخ کے نزدیک یہ بالکل غلط ہے وہ تصریح کرتے ہیں کہ کمال مقصود کا حصول اس

(۱) اس راہ کا ڈاکو (۲) اس راہ میں رکاوٹ ہی نہیں بلکہ راستہ کو منقطع کرنے والا ہے۔

پر موقوف نہیں اور قید اجازت کا راز یہ ہے (۱) کہ امر بالمعروف (۲) کے لیے کچھ آداب ہیں جن کے قابل ہر اک نہیں ہوتا مثلاً بعضوں کو سیاست وتدبیر کا ملکہ نہیں ہوتا جس کے بغیر امر بالمعروف بجائے مفید ہونے کے موجب فتنہ وفساد ہوجاتا ہے۔ اس لیے بعض لوگوں کو گو وہ درجہ کمال کو پہنچ چکے ہوں ارشاد وتلقین ونفع متعدی کی اجازت نہیں دی جاتی مگر اس سے ان کے کمال کی نفی نہیں ہوتی حالانکہ نفع متعدی کا مقصود بالذات ہونا اس صورت میں نفی کمال کو مستلزم ہے (۳) جو اجماع محققین کے خلاف ہے دوسرے میں پوچھتا ہوں کہ اگر نفع متعدی مقصود بالذات ہے تو حربی دارالحرب میں اسلام لائے اور نفع متعدی پر قادر نہ ہو تو بتلایئے وہ کیا کرے نفع لازمی کو لازمی پکڑے یا نفع متعدی کو۔ اگر نفع متعدی میں مشغول ہونا لازم کیا گیا تو تکلیف مالایطاق (۴) اور اگر نفع لازمی کا اس کو امر کیا گیا تو ثابت ہوا کہ نفع متعدی مقصود بالذات نہیں کیونکہ مقصود بالذات سے کوئی مسلمان محروم نہیں ہوسکتا۔ یہ سب اس امر کے دلائل ہیں کہ نفع متعدی مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالعرض ہے۔ اور مقصود بالذات نفع لازمی ہے پس وہی افضل بھی ہے کیونکہ مقصود بالعرض سے افضل ہوا کرتا ہے۔ یہ جواب ہوگیا شبہ مذکورہ کا اور ثابت ہوگیا کہ خود نفع متعدی مقصود بالذات نہیں اس لیے مقصود آیت، وہ مفضی ہوگا نفع لازمی کی طرف اس لیے وہ بھی اوقد ہوجاتا ہے اور یا قول مشہور مؤول ہے (۵) یعنی نفع لازمی یعنی اپنے عمل کے ساتھ نفع متعدی یعنی تبلیغ بھی جمع ہوجائے۔ یہ نفع متعدی خاص مقرون بالعمل افضل ہوگا صرف نفی لازمی سے کیونکہ مجموع مطلوبین کا افضل ہوتا ہے مطلوب واحد سے باقی موازنہ اس سے ہوسکتا ہے کہ ایک شخص صرف نمازی ہے نماز کا مبلغ نہیں اور ایک شخص صرف نماز کا مبلغ ہے نمازی نہیں۔ ان میں دیکھو کون افضل ہے اس معیار کے بعد مسئلہ میں کوئی خفا نہیں رہ سکتا۔

(۱) دوسروں کی تربیت کرنے کے لیے شیخ کی اجازت کی ضرورت کا یہ راز ہے (۲) نیکی کا حکم کرنے (۳) اس سے کمال کی نفی لازم آتی ہے (۴) ایسی بات کا حکم دیا جارہا ہے جس پر وہ قادر نہیں (۵) تاویل کی جائے گی۔

خلاصۂ وعظ

اب میں ختم کرتا ہوں خلاصہ تمام بیان کا یہ ہے کہ تعلق مع اللہ اصل مقصود ہے تو ہم کو زیادہ اہتمام اس کا کرنا چاہیے اور جن کی طرف مخلوق کا رجوع ہو خواہ دین کی غرض سے یا دنیوی غرض سے ان کو تعلق مع الخلق کا وقت منضبط کرنا چاہیے اور باقی وقت خدا تعالیٰ کی یاد میں صرف کریں۔ خصوصاً وہ لوگ جن کو خدا تعالیٰ نے ملازمت وغیرہ سے مستغنی کیا ہے جن کے گھر میں کھانے پینے کا سامان موجود ہے ان کو اس کا اہتمام زیادہ کرنا چاہیے کیونکہ ان کو دوسروں سے زیادہ ذکر حق کا موقع مل رہا ہے خوب کہا ہے ایک عارف نے۔

خوشا روزگارے کہ دارد کسے کہ بازار حرصش نباشد بسے
بقدر ضرورت یسیارے بود کند کارے ار مرد کارے بود(۱)

ایک مضمون ذہن میں پہلے تھا بلکہ چند مضامین تھے مگر اب ذہن سے نکل گئے اس لیے ختم کرتا ہوں اور ان کا ذہن سے نکل جانا شاید اسی حکمت سے ہوا ہو کہ وقت بھی نہیں رہا۔ اب دعا کیجئے کہ اللہ تعالیٰ اس بیان کو نافع فرمائے اور ہم کو تعلق مع الحق (۲) کی توفیق دے اور تعلق مع الخلق سے فراغ نصیب ہو۔ (۳)

وصلی اللّٰہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی الہ واصحابہ اجمعین والحمد للہ رب العالمین۔ اشرف علی ۱۲ ج ۱۳۵۰ھ (۴)

---

(۱) ''اسی کا اچھا زمانہ ہے کہ اس کو زیادہ حرص نہیں۔ ضرورت کے موافق مالداری ہو کام والا آدمی کام کرتا رہے'' (۱) رجوع الی اللہ کی توفیق دے (۲) لوگوں کے دھندوں میں مشغولی سے فراغت ہو (۳) اللہ تعالیٰ تمام قارئین کو اس وعظ سے مستفید ہونے کی توفیق عطا فرمائیں۔ آمین۔

خلیل احمد تھانوی
۹ محرم الحرام ۱۴۳۹ھ